سلسلۂ مطبوعات حیدرآباد تلگو اکاڈیمی شمارہ (۶)

اسرارحیات

(حقایقِ زندگی کے متعلق آندھرا صوفی دنیا کے تخیلات)

از

ایشورا تُوپا، ڈی لٹ

جامعۂ عثمانیہ
حیدرآباد

۱۹۴۴ء

فہرست

دنیا کی زندگی اور اس کی شاعری از پروفیسر آرستبا راو

دیباچہ

ہدیۂ تشکر

حیدرآباد تلگو اکاڈیمی جس کے پیش نظر اعلیٰ تمدنی مسلک ہے، ڈاکٹر ایشور ٹوپا (جامعۂ عثمانیہ) کی مرہونِ منت ہے کہ انھوں نے "اسرارِ حیات" لکھ کر ویما پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے۔ اِس کتاب کو اکاڈیمی مسرت کے ساتھ شایع کر رہی ہے۔

اکاڈیمی مسز رہینہ حیدری کا خلوص کے ساتھ شکریہ ادا کرتی ہے کہ آپ نے ویما کی قلمی تصویر اتار کر آرٹ اور تمدن سے اپنے شغف اور دلچسپی کا بین ثبوت دیا ہے۔

ویما کی زندگی اور اس کی شاعری

ویما، ویمنا یا ویما یوگی کا نام تین کروڑ آندھراؤں کی زبان پر ہے جن کی مادری زبان تلنگی ہے۔ آندھرا دیس کے اس فلسفی شاعر کا کلام تقریباً دو ہزار یا دو ہزار پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ زبان کی سادگی، چھوٹی چھوٹی بحروں، روز مرہ محاوروں اور تمام ضرب الامثال کا بلا تکلف استعمال اس کی شاعری کا امتیاز ہے۔ ویما کی زبان قواعد کی رو سے بعض مرتبہ آزاد نظر آتی ہے اور عام بول چال کا اثر نمایاں ہے۔ اس کی زبان پرانی نہیں اور نہ اس میں لفاظی ہے، بلکہ وہ چٹکلوں سے بھرپور اور

گھٹی ہوئی ہے۔ ویما کے اشعار بھی آندھرا دیس کے عالموں اور جاہلوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں ویما کے اشعار فلسفے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن پر طنزیہ رنگ غالب ہے۔ اس کی ہر نظم کا آخری شعر عام طور پر شاعر کے نام کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ویما کے اشعار عموماً احترام کے ساتھ پڑھے اور بطورِ حوالے کے استعمال کیے جاتے ہیں اور بالخصوص مہذب طبقہ ان کے چبھتے ہوئے طنز اور ظرافت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس امر کے بیان کرنے میں ہمیں پس و پیش نہیں کہ ویما کو ادیبوں اور شاعروں نے عزت کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن یہ سچ ہے کہ سیدھے سادھے لوگوں پر ویما کا گہرا اور دائمی اثر اب بھی پایا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آندھراؤں میں تعصب اور تنگ نظری نہیں پائی جاتی اور نہ وہ اپنی افتادِ طبع یا روایات کے لحاظ سے تارک دنیا واقع ہوئے ہیں۔ دنیا کی ہر اچھی چیز سے

انہیں دلی لگاؤ ہے ۔ ان کے ذہن کشادہ اور تاثیر پذیر ہیں ۔ فطرتًا جذباتی اور طبعًا فن کارانہ حیثیت سے ان کی زندگی پر افادیت اور عملیت کی بجائے نصب العینی اور خیالی رجحانات کا اثر زیادہ نظر آتا ہے ۔ ان کی روح جمالیات کے تابع ہے، نہ کہ مذہب کے، لیکن ساتھ ہی ساتھ جدت، تہذیب و اصلاح پسندی آندھرائی زندگی کے قوی عناصر ہیں ۔ ان حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر آندھراویں کی تمدنی تاریخ پر معمولی سی نظر ڈالی جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ ویما جیسی کامل تارک دنیا ہستیاں اس میں بہت ہی کم ملتی ہیں گو گرو شنکر آچاریہ کی تین مشہور مٹھوں کے پیشواؤں کا انتخاب اکثر آندھرا برہمنوں کے طبقے سے ہوتا ہے ۔

سنہ ۱۸۲۵ء میں چارس فلپ براؤن کو، جو انڈین سیول سروس کے رکن تھے، اپنی ملازمت کے دوران میں آندھرا ضلعوں میں ویما کے اشعار سننے کا اتفاق ہوا تھا اور ان کے تخیل کی بلندی اور زبان کی سادگی سے وہ ایسے متاثر ہوئے کہ ویما

کے کلام کے مختلف قلمی نسخے تلنگانے کے مختلف حصوں سے جمع کرنے کی کوشش کی اور چند پنڈتوں کی مدد سے ان کی جانچ پڑتال بغرض اشاعت کی گئی۔ مسٹر براؤن نے بھی بذات خود ویما کے مختلف مسودوں میں سے تقریباً دوسو اسی ۲۸۰ اشعار کا انتخاب کرکے اپنے انگریزی ترجمے کے ساتھ شایع کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۰۴ء میں بمقام مدراس تلنگی ادبیات کی نشاۃ ثانیہ کی پہلی دہائی منائی گئی جس میں ویما بحیثیت شاعر فلسفی اور صوفی کے تعظیم کی نظروں سے دیکھا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدید ادیبوں کی توجہ ویما پر متواتر مبذول رہی۔ وقتاً فوقتاً ویما کے کلام کے مختلف ایڈیشن شایع ہوتے رہے اور بعضوں نے اپنے ادبی رجحان طبع کے تحت صوفی ویما کی نظموں اور دوہوں کا انتخاب کرکے ملک کے سامنے پیش کیا۔ اس کی جیون بیتیاں بھی شایع کی گئیں۔ اس ضمن میں مرحوم کے۔ وی۔ لکشمن راؤ اور سر۔ سی۔ آر۔ ریڈی جیسے جید عالموں نے اس بڑے انسان کے مختلف

پہلوؤں پر قلم اُٹھایا۔

ویما کے زمانے کے متعلق بہت کم ایسا مواد ہے جس کی بنا پر یہ تعین ہوسکے کہ وہ کس زمانے کا آدمی تھا۔ مسٹر براؤن کے خیال کے مطابق ویما کا دورِ حیات سترھویں صدی عیسوی کا ہے۔ اس کے برعکس آندھرائی ریسرچ اسکالرز کی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ ۱۳۸۶ء تا ۱۵۰۵ء کا زمانہ دراصل ویما کا زمانہ تھا۔ اس کی سن پیدائش غالباً ۱۴۱۲ء یا ۱۴۲۲ء بتلائی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ویما کا دورِ حیات وجیانگر کے راجا سری کرشنا دیو رائے سے قبل اور مذہبی پیشوا ویراشیو مسلک کے بانی مبانی سری بسوا کے بعد کا ہے۔ اس کے مقام پیدائش کے متعلق بھی اسی قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ البتہ ویما کی ایک نظم کے بند سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس کی پیدائش کا مقام موگا چنتا پلی کا موضع ہے جو تعلقہ انگول میں واقع ہے لیکن ویما نے کنڈا ویڈو میں جو ضلع گنٹور کا ایک قصبہ ہے اور جو

کسی زمانے میں ریڈی راجاؤں کا شاہی قلعہ بھی تھا، مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔ وہ کہتا ہے کہ

"میرا گاؤں کنڈا ویڈو۔ میرا رین بسیرا
موگا چنتا پلی کے مغربی کوچہ کا پہلا گھر
اور میری ذات غیر مہذب ریڈیوں کی ہے۔"

ویمنا کے بیان کے ماسوا دوسرے روایتی ذرایع سے اسی بات کی توثیق ہوتی ہے کہ و شاید کنڈاویڈو میں پیدا ہوا ہو اور غالباً اپنی زندگی ضلع اننتاپور کے ایک موضع گنڈی کوٹا میں بسر کی اور کتھار پلی میں جہاں ویمنا کی سمادھی ہے ہر روز پوجا پاٹ ہوتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ویمنا کا اصلی وطن غالباً ceded districts میں تھا۔ گو بہت ممکن ہے کہ اس نے تمام اضلاع تلنگانہ کی سیاحت کی ہو لیکن اس کی زبان اور وہ صوبہ واری محاورے جو بغیر کسی غلطی کے، ویمنا نے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں وہ مذکورہ عام خیال کی بالواسطہ طور پر تائید کرتے ہیں۔

مسٹر براؤن نے ویما کی ذات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ویما کا تعلق جنگم ذات سے تھا جو درحقیقت تلنگانے کے بھاٹ تھے اور جنھوں نے ویر شیو مذہبی مسلک کو قبول کیا تھا، لیکن مسٹر براؤن کا یہ خیال ایک بالکل غلط مفروضے پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ویما کپو فرقے کا ایک فرد تھا اور جس کے متعلق خود ویما نے ادبی پیرائے میں بیان کیا کہ اس کی ذات میں دودھ کی طرح مٹھاس اور صفائی ہے۔

ویما کی اعلیٰ تعلیمات، اس کا انتہائی ذوق، اس کے سوز و گداز اور اس کی خوبیوں کو خاطرخواہ طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے زمانے پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ حکومت کاکاینا کے زوال کے بعد آندھرا دیس میں سب سے زبردست اور مقتدر قوت ریڈیوں کو حاصل تھی اور ان کی حکومت اونگی، کنڈاویڈو اور راجمندری تک پھیلی ہوئی تھی۔ انکا عہدِ حکومت تقریبًا ڈیڑھ سو سال تک رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے

جس میں آندھرا دیس کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیاں نمایاں تھیں۔ ریڈی راجا صرف ادب کے مربی اور محسن ہی نہیں بلکہ وہ خود بڑے شاعر اور مفسر بھی تھے۔ تلنگی زبان کے زبردست شاعر ایرا پیر اگڈا، وامنا بھٹ اور سری ناتھا کو ریڈی دربار میں سرپرستی حاصل تھی۔ انہیں ریڈی راجاؤں کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق کا نتیجہ تھا کہ کالی داس کے ڈراموں کا مطالعہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے کیا گیا۔ اس طرح انھوں نے اپنے تبصروں میں اعلیٰ جمالیاتی ذوق کا ثبوت دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ کمار گری ریڈی (سنہ ۱۴ء) جو اپنے عیش و عشرت کی وجہ سے مشہور تھا کالی داس کے مشہور تخیلی کردار اگنی متر کی طرح حرم کا متوالا تھا۔ دنیا کو بہشت بناتا اس کا مقصد حیات تھا۔ رقص و سرود، عیش و عشرت اس مقصد کو حاصل کرنے کی راہیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب بسنت کا تہوار آتا تھا تو اس کی عیش و عشرت کی محفلیں دن اور رات خوب گرم رہتی تھیں۔ سری ناتھا شاعر کی زندگی اور اسکی

شاعری اس زمانے کے عشرت پرستانہ رجحان کی خاصی نمایندگی کرتی ہے۔ اس زمانے کی آندھرائی سماج پر فرمانروائے وقت کی غیر محتاط عشرت پرستی کا غیر معمولی اثر پڑا تھا یعنی لوگوں کے معاشرتی تعلقات، ان کی گھریلو زندگی اور انکے اخلاق روز بروز پست سے پست تر ہوتے جا رہے تھے۔

جب آندھرا دیس کی معاشرت عیش و عشرت سے زوال پذیر ہو رہی تھی تو ریڈیوں کی حکومت چاروں طرف دشمنوں سے گھری ہوئی تھی۔ ریڈی حکومت کا زبردست دشمن سنگاما نائک تھا۔ اس کا پائے تخت راسا کنڈہ تھا جو حیدرآباد کے قریب واقع تھا۔ اس وقت بہمنی حکومت کا فرمانروا محمد شاہ تھا۔ کرناٹک پر راجا ہری ہر رائے دوم کی حکومت تھی اور اس کے ولیعہد دیورائے کے ہاتھوں میں اودیگری اور نیلور کی عنان حکومت تھی۔ یہ شاہزادہ موقع کا متلاشی رہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ریڈی خاندان کو تہ و بالا کرکے اس کے جاہ و جلال کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردے گویا اس وقت کے تمام فرمانروا ریڈی

خاندان کو رشک و رقابت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

مذہبی لحاظ سے آندھرا دیس پر شیومت غالب تھا، کیونکہ شیو مبلغین نظموں اور بھجنوں کے ذریعے سے اپنے مذہب کا پرچار کر رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیومت اور اس کی رسم پرستی کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ ویر شیوی تحریک کا ردعمل معمولی نوعیت کا نہ تھا اور اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ ملک میں ایک نئی انتقامی ذہنیت ویدوں کے احکام، ویدی رسم پرستی ذات بندی کے قواعد کے خلاف پیدا ہوگئی۔ انسان کی یکتائی اور کامل وحدت کے تخیل نے سماج کے امتیازی قوانین اور رسم پرستی پر غلبہ حاصل کرلیا۔

ویر شیوی ادیبوں نے برہمنی نصب العین اور رسم پرستانہ طرز کے خلاف شدت سے لکھ کر برہمنوں اور ان کی کتابوں پر دل کھول کر حملے کیے۔ عوام اس وجہ سے بھی متاثر ہوئے کہ ویر شیوی ادیبوں نے عام فہم بحروں اور

عام فہم زبان میں اپنی تصانیف لکھیں جنکو پڑھ کر ایک ادنیٰ انسان اثر لئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان تصانیف کی کامیابی کا راز یہ بھی تھا کہ انھوں نے برہمنی اصول اور نظام زندگی کی قدیم بنیادوں کو کھوکلا کردیا۔ ویرشیوؤں نے عوام کو تاریکی اور لاعلمی سے نجات دلائی اور سماج میں نئی بیداری پیدا کی تاکہ عوام کا عالم جمود ٹوٹ سکے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انہیں کے خیالات اور ان کی اصلاحی سرگرمیاں سماجی تجدید کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ اس قسم کی پر تشدد تحریکیں جنھیں الہامی تقدس بھی حاصل تھا عام طور پر بے لگام ہوگئیں۔ تصادم اور انتشار کے پیدا ہونے کی وجہ بنیں۔ جہاں تخریبی قوتیں نہایت ہی سرعت کے ساتھ پھیلیں وہاں اُن کے برعکس تعمیری قوتیں اپنا کام بھی آہستہ آہستہ کرنے لگیں اور مشکلات و دشواریوں پر عبور حاصل کرتی رہیں۔

دیما کے جنم سے قبل اس دور کی تصویر میں انقلابی اور تخریبی عناصر کی رنگینیت نمایاں

تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسی دور میں ویما بھی گزرا ہو۔ یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ شاید ویما نے خود اپنی آنکھوں سے ریڈی حکومت کو پاش پاش، اور ریڈی حکمرانوں کے زندہ کردہ ادبی اور جمالیاتی معیاروں کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھا ہوگا ویما کے کلام میں جذبات کی جو شدت اور گرم جوشی پائی جاتی ہے وہ پوری طرح اس زمانے کی ترجمانی کرتی ہے۔

مہاپرشوں اور بھگتوں کی جیون بیتیوں میں جس طرح حقیقت نگاری پر افسانوی رنگ چڑھایا جاتا ہے، اسی طرح ویما کی جیون بیتی میں بھی کیا گیا۔ تلنگی ادبیات کے ایک دبستاں کا خیال ہے کہ ویما کنڈا ویڈو کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم اور بہترین قابلیت کا ایک زندہ نمونہ بھی تھا۔ اس کے باوجود اس نے ادبی معیاروں کو ٹھکرا کر اپنے کلام میں روز مرہ کی زبان استعمال کی کیونکہ اس کا یقین تھا

کہ عوام کی زبان مردہ نہیں ہے۔ دوسرا دیشاں اس خیال پر مصر ہے کہ ویما ایک معمولی دیہاتی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی تھی، لیکن جو روحانی اور روشن ضمیری کی منزلیں اس نے طے کیں وہ در حقیقت اس کے گرو سوم ناده کی تربیت اور تعلیم کا نتیجہ تھیں۔ ہمیں اس امر کے بیان کرنے میں عار نہیں کہ ویما نے قدیم طریقِ تعلیم نہیں پائی تھی، لیکن ویما کی شخصیت میں اعلیٰ حکمت اور فوق الفطری بصیرت کار فرما تھی۔

ویما کی تعلیمات اور اس کا فلسفہ کیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ مذہب، فلسفہ اور سائنس یہ سب آواز اور کلام کے پابند ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے مذہب، فلسفہ اور سائنس تشکیل پاتے ہیں، ان کا تحفظ ہوتا ہے اور آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہوتی ہیں۔ چنانچہ ویما کے کلام کو غیر متعلق سمجھ کر کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی اعتبار سے

دیما کا کلام اس رد عمل کی کیفیت کو پیش کرتا ہے جو دنیا کے ماحول سے ایک بڑے انسان میں ظاہر ہوتی ہے اور نظام فلسفے کی حیثیت سے وہ ایک سچے متلاشی کا آئینہ دار ہے جو سچائی کی تلاش میں منہمک ہو۔ لہٰذا دیما کی شاعری اور اس کا فلسفہ قابل مطالعہ ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گو دیما کے کلام میں اضافی عبارتیں موجود ہیں لیکن اس کا کلام مختلف عنوانوں اور مسائل کا ایک عجیب مجموعہ ہے جس پر اس کتاب کے مؤلف نے تحقیقی روشنی ڈالی ہے۔ دیما کے کلام کے اہم ترین عنوان یہ ہیں: مذہب تہذیب و تربیت، انسان اور سماج، امارت و غربت، رسم پرستی برہمنیت اور اس کا نظام اور طنز۔ اس ضمن میں یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ دیما ایک شدید تخریبی طنز نگار ہے، لیکن اس کے تخیلات کا سلسلہ وار مطالعہ اگر کیا جائے تو اس غلط فہمی کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ اس میں

کچھ شک نہیں کہ ویما کے طنز میں چبھن، چوٹ اور سختی پائی جاتی ہے۔ ویما کے زمانے کے گرے ہوئے سماجی معیار نے اس کے طنز میں تلخی پیدا ضرور کی تھی لیکن وہ کینہ اور تعصب سے پاک ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ ویما نے اپنے طنزیہ طریقے سے جو چوٹ کی ہے وہ نسبتاً زیادہ سخت ہے۔ اس کی آواز میں سختی اور تلخی ہے اور اس نے شاید ہی کسی فرقے، عقیدے یا رسم پر حملہ نہ کیا ہو۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

"لنگایت مت تمام چھ متوں میں نہایت ہی اعلیٰ ہے لیکن لنگ دھاریوں سے بدترین چور کوئی نہیں۔"

یا

اختلافات ہوتے ہیں مذہب کے پیروؤں میں لیکن مذہب کی روح میں کوئی اختلاف نہیں۔ ایک ویشنو ریشمی لباس پہنتا ہے، اپنی پیشانی پر ویشنوی نشانی کھینچ کر اپنے کو برتر سمجھتا ہے لیکن وہ

تاڑی پیتا ہے اور دنیا کو دھوکہ دیتا ہے۔"

یا

"اپنے سر کے بالوں کو بڑھا کر جٹائیں بٹتے ہیں، اپنے تمام جسم پر بھبوت ملتے ہیں لیکن سنیاسی اپنے گیروے لباس کو طوائف کے لہنگے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔"

ویما کے کلام میں اس قسم کے تلخ دوہوں کے علاوہ ایسے دوہے بھی پائے جاتے ہیں جن میں ویما اپنے نصب العین کا اظہار کرتا ہے:

"تمام دنیا کے انسانوں کے سامنے ایک کھانے کا تھال رکھو اور ان سے کہو کہ وہ ساتھ مل کر کھائیں اور ذات پات کو ترک کریں۔ ان کے سر پر اپنا ہاتھ رکھو اور اس عقیدے میں انہیں یقین دلاؤ۔"

یا

"تم پتھروں کے سامنے سر جھکاتے ہو بغیر یہ محسوس کیے کہ خدا تمہارے دل میں ہے۔ اگر اسکا وجود واقعی ہے تو کیا وہ پتھر میں ہے

یا زندگی میں ؟"

یا

" وہ اپنے اعضا کو اذیت پہنچاتے ہیں اور
اپنے آپ کو یوگی کہتے ہیں، لیکن وہ
اپنے دل کی کدورت کو صاف کرنے سے
قاصر ہیں۔"

ویما کا صرف یہی رنگ ہی نہیں ہے بلکہ
اس نے ویدانتی طرز میں بھی اکثر دوہے
کہے ہیں:

" اے معبود! جب میں تجھے دیکھتا ہوں تو
اپنے آپ کو بھول جاتا ہوں، لیکن
جب میں اپنے کو دیکھتا ہوں تو تجھے
بھول جاتا ہوں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ تجھے
اور اپنے کو ایک ہی وقت میں دیکھ سکیں۔"

ویما کے خیال کے مطابق تمام خیراتوں میں سب
سے بہترین خیرات بھوکے اور حاجت مند
کو کھانا کھلانا ہے:

" وہ شخص جو محتاج کو مٹھی بھر کھانا دیتا
ہے سیدھا بہشت چلا جاتا ہے۔ دنیا میں

کوئی خیرات کھانے کی خیرات سے بہتر نہیں۔"

یا

"وہ شخص جو ہیرے جواہرات کی طرح جوار کو جمع کرکے، اس کو اچھی طرح پیس کر اور پکا کر بھوکے کو کھلاتا ہے اس کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حقیقت میں خود شیو ہے۔"

ان دوہوں کے علاوہ ویما کی نظموں میں کئی عبارتیں ایسی ملتی ہیں جو اسکی قوت مشاہدہ اور اس کے خیال کی مٹھاس کو پیش کرتی ہیں مثلاً :-

"نمک اور کافور میں گہری مشابہت تو ضرور ہے لیکن ان دونوں کے ذایقے اور خصوصیات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح انسانوں میں بھی دانشمند اور عامی ہیں۔"

یا

"بیوی بغیر صبر وتحمل کے، بچہ بغیر ذہانت کے اور اعلیٰ علمیت بغیر حسنِ سیرت کے سب بیکار ہیں۔"

یا

ایک چھوٹا سا کیڑا بڑے درخت کو گھن لگا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک معمولی بدکردار آدمی سارے خاندان کو برباد کر دیتا ہے۔

یا

اگر ایک دشمن جا ہے وہ سولی پر لٹکانے ہی کے قابل کیوں نہ ہو، تمھارے ہاتھ آجائے تو کبھی ایذا نہ دو۔ اس کے برعکس اس کی خاطر خواہ امداد کرو اور اس سے کہو کہ وہ صحیح و سلامت چلا جائے۔ تمھارا یہ حسنِ سلوک اس کے لیے موت ہے۔

یا

اگر ایک کتّے کی تاج پوشی کسی مبارک موقع پر کی جائے اور اس کو سونے کے تخت پر بٹھایا جائے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اپنی فطرت بھول جائے گا؟

یا

تم ایک بیج کا مقابلہ ایک برگد کے درخت سے کیوں کرتے ہو؟

اسی قسم کے متعدد اقوال ویما کے کلام سے پیش کیے جاسکتے ہیں ۔

ویما کی قوتِ خیال اور جذبات کی گہرائی میں اس کی وسعت نظری اور اس کے قلب کا سکونِ پنہاں تھا ۔ ویما انسانیت کا وہ غیر معمولی نمونہ تھا جس نے اپنی زندگی میں دوسروں کو امن و سکون کا پیام ہی نہیں دیا بلکہ وہ خود کامل انسان کے درجے پر پہنچ گیا تھا یعنی توحید کے راستے پر چل کر اس نے اپنی تہذیب و تربیت کی تھی ۔ اس کی تہذیب کا پیام کامل وحدت کا پیام تھا ۔

آر ۔ سبّاراؤ

جامعۂ عثمانیہ
۱۵ مئی ۱۹۴۴ء

دیباچہ

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کی زندگی اور معاشرت کے سمجھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس زمانے کی بڑی بڑی ہستیوں کو سمجھا جائے۔ یہ ہستیاں وہ تھیں جنھوں نے اصلی ہندوستان کو زندہ رکھا تھا۔ اِن میں بالخصوص صوفی سنتوں کے کارنامے قابلِ تحسین اور تعریف ہیں۔ صوفیت کے زمرے میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ ہندوستان کی اصلی تہذیب انھیں کے ہاتھوں ہوئی اور پروان چڑھی اور یہی ہماری تہذیب کے سب سے بڑے پیشرو اور علمبردار بھی تھے۔ آجکل کے جدید ہندوستانی صوفی کا نام سنتے ہی یہ تصور کرنے لگتے ہیں کہ وہ دنیا کیلئے ایک بیکار ہستی ہے اور دنیا کو ان کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ صوفی محض اس انسان ہی کو نہیں کہتے ہیں جو اپنا رشتہ خدا سے ہمیشہ کے لیے جوڑ چکا ہو بلکہ انسان ہونے کی حیثیت سے بھی وہ اپنے میں بہت سے پوشیدہ

انسانی جوہر رکھتا ہے۔

ہندوستان کے صوفی اور بھگت خدا کے پریمی تو ضرور تھے لیکن اِن کے پریم کا تعلق انسانوں سے بھی بہت زیادہ تھا۔ خدا میں لین رہتے تھے۔ خدا کے بندوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ خدا پرستی نے اِن میں ایسے جذبات اور احساسات پیدا کردیے تھے کہ وہ انسانی رشتے کو منقطع نہ ہونے دیتے تھے۔ اِن کی صوفیت میں انسان کی بھلائی مقدم تھی۔ ہندوستان کے بڑے صوفیوں اور بھگتوں کی زندگی پر اگر سرسری نظر دوڑائی جائے تو یہ امر عیاں ہوجائے گا کہ وہ درحقیقت انسان کے خادم تھے۔ انکے سچے عقیدے کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا کی خدمت کا راستہ انسان کی خدمت میں ہے۔ لہذا ہمارے ملک کے خدا ترس اور خدا پرست بزرگوں نے انسان کی فلاح کو اپنی فلاح سمجھا اس ہی میں اِن کو خدا کے درشن نصیب ہوئے لیکن انسانوں کی زندگی میں وہ ایسا دور رس انقلاب پیدا کرگئے جس کا اثر ہمارے ملک کی عام زندگی پر صدیوں تک نمایاں رہا۔

انسانیت کا پرچار ہندوستان کے صوفیوں اور بھگتوں نے کیا تھا اور انسان کو یہ بتایا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں انسانیت کے اصول کو کس طرح پیوست کرسکتا ہے۔ یہ بزرگ

ان اصولوں کے مخالف تھے جن کے ذریعے انسان اور انسان
میں پھوٹ ، نفرت اور فرقہ واریت پیدا ہو بلکہ ان کی زندگی
بذاتِ خود انسانی اُصول کی زندہ نمونہ تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ
عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کی زندگی
میں اتفاق ، اتحاد اور ہم آہنگی پائی جاتی تھی ۔ ہندوؤں کے
مسلمان اور مسلمانوں کے ہندو پیرو تھے اور ایک دوسرے سے
اثر لے کر متاثر ہوا کرتے تھے ۔ ہندوستان کی تمدنی ، سماجی تاریخ
ان واقعات سے بھری پڑی ہے کہ صوفیوں کے پیرو ہندو اور
بھگتوں کے پیرو مسلمان تھے ۔ ہندو یا مسلمان بزرگ عوام کی زندگی پر
یکساں اثر رکھتا تھا اور نہ عوام اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ
وہ کس کے پیرو ہیں ۔ ہندو اور مسلمانوں کے رشتۂ اتحاد کی
تشکیل میں صوفی اور بھگت اپنا اپنا کام کر گئے جس کو جدید
ہندوستان سمجھنے سے قاصر ہے ۔

ہمارے انھیں بزرگوں میں سے ویماؔ کی ایک ہستی تھی
جو انسان کی زندگی کی صحیح تشکیل کے درپے رہی تھی ۔ ویماؔ
کے فلسفۂ حیات پر غور و خوض کرنے کے بعد میں نے اس کی
جرأت کی کہ اس کی ہمہ گیر ہستی کے تخیلات کو اس چھوٹی سی
کتاب کی صورت میں پیش کروں ۔ ویماؔ کی زندگی کے حالات
اور اس کے زمانے کے متعلق پروفیسر ستیا راؤ صدر شعبۂ تلنگی

جامعۂ عثمانیہ نے اپنی تمہید میں تفصیلی ذکر کیا ہے ۔ پروفیسر موصوف تلنگانے کے ایک مشہور و معروف شاعر ہیں اور تلنگی ادب کی دنیا میں ان کی شہرت کا چرچا عام ہے ۔ میں ان کا بیحد ممنون ہوں کہ تمہید لکھ کر انھوں نے میری عزت افزائی کی۔

ویما کے تخیلات کو قلمبند کرنا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ اس کتاب کی تیاری میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تلنگی زبان سے ناواقفیت میری پہلی مشکل تھی ۔ میں نے ویما کے مقولے انگریزی ترجمے کے ذریعے پڑھے اور مسٹر براؤن کے انگریزی ترجمے کو اردو قالب میں ڈھال کر ویما کے فلسفۂ حیات پر لکھنا شروع کیا ۔ ویما کے کئی سو مقولے ہیں ۔ میں نے ان میں سے صرف بہترین مقولوں کا انتخاب کیا ہے ۔ یہ تمام کے تمام بے ترتیب تھے ۔ ان کو مختلف عنوانوں کے تحت لاکر ویما کے تخیلات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ۔ میں اس امر سے لاعلم ہوں کہ مجھے اس کے تخیلات کی وضاحت میں کامیابی کہاں تک ہوئی ہے ، لیکن میں اس بات سے باخبر ہوں کہ ویما واقعی ایک بہت بڑا انسان تھا ، جس کا مسلک یہ رہا تھا کہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں کی زندگی کی تہذیب اور پرداخت کرے ۔ اس کا تمام فلسفۂ حیات خدا پرستی کا نتیجہ تھا ۔

اصولِ انسانیت کا پرچار ویما نے خدا پرستی میں پایا تھا کیونکہ حکمت خدا پرستی میں پوشیدہ ہے۔ انسان اپنے سے اس وقت تک بے خبر ہے جب تک کہ وہ خدا کو نہیں جانتا ویما کا فلسفۂ حیات ایک مردہ خیال نہ تھا اور نہ ناقابلِ عمل بلکہ اس میں حرکی قوتیں پنہاں تھیں۔ وہ حقیقت میں انسان کو اس کے انسانی جوہر سے آگاہ کرانا چاہتا تھا، کیونکہ اُس کا عقیدہ تھا کہ انسانیت بغیر خدا پرستی یا خدا پرستی بغیر انسانیت کے ممکن نہیں۔ انسان انسان بن کر ہی خدا پرست ہوسکتا ہے۔ غیر انسان ہو کر خدا پرست نہیں بن سکتا۔ ویما کے اس انسانی پہلو نے خدا پرستی پر نئی روشنی ڈالی ہے۔ میرے خیال میں ویما کا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے انسان اور خدا میں ایک نیا رشتہ جوڑا جو کہ اس وقت تک جڑ نہیں سکتا جب تک کہ انسان اپنی تہذیب میں منہمک نظر نہ آئے۔

ویما دنیا کے انسانوں کی فطرت کا معلّم تھا۔ اس کے تخیلات خود اس کے زمانے کے لیے اتنے ہی اہم تھے جتنے کہ دنیا کے عام انسانوں کے لیے جو ہر زمانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ویما کے پیام کی پکار آج بھی ویسی ہی سُنی جاسکتی ہے جیسے کہ اس کے زمانے میں سُنی گئی تھی۔ ویما کا پیام وقتی نہ تھا، بلکہ عام انسانی پیام ہے جو ہر ملک یا

ہر قوم کا انسان سمجھ سکتا اور اس سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ ویما کے تخیلات کے اس محرک نے مجھ کو مجبور کیا کہ میں اس کے مقولوں کا اُردو میں ترجمہ کر کے اس کے فلسفۂ حیات کو اس کتاب کے ذریعے پیش کروں۔

آخر میں میں حیدرآباد تلگو اکاڈیمی کا مخلصانہ شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ کتاب اس کی جانب سے شایع ہو رہی ہے۔

ایشورا ٹوپا

۲۷ جارج ٹاؤن
سکندرآباد
۲۴ / اپریل ۱۹۴۴ء

"جہاں عورتیں ہیں وہاں دل بہلائی ہے۔ عورتیں اگر نہ ہوں تو شہر ویران ہوجائیں۔ ان کے ہاتھوں میں مرد پھنسے ہوئے ہیں"۔ ویما

"ہم عورتوں کے گن ہی نہیں گاتے بلکہ بلا تفریق اور امتیاز ہمیں وہ پسند ہیں"۔ ویما

عورت! عورت کیا ہے؟!! آدھا میوہ آدھا پھل

سجاد حیدر

پہلا باب

انسانی تہذیب کا راستہ

ویما نے انسانیت کے پیام کو ہندوستان کی دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اپنے ملک کے مختلف طبقوں کے تہذیبی اور تمدنی حالات سے اس کو بخوبی واقفیت تھی۔ وہ اعلیٰ اور ادنیٰ ترین لوگوں کی خوبیاں اور برائیاں بھی جانتا تھا۔ اہلِ ملک کی زندگی نے اس کو یہ دکھا دیا تھا کہ انسان ابھی اعلیٰ تہذیب اور تربیت سے بہت دور ہے۔ اعلیٰ طبقے کا یہ دعویٰ کہ وہ ملک کے تمدن کے علمبردار اور محافظ ہیں ویما کے دل کو یہ بھاتا نہ تھا۔ اس کے خیال میں ان کی تہذیبی علمبرداری زندگی کے حقایق پر مبنی نہیں تھی۔ ان کو سماجی اعزاز حاصل تو ضرور تھا لیکن وہ انسان کی حیثیت سے گرے ہوئے تھے۔ ویما نے اِن کے معیاروں کو جھٹلایا اور انکی طرزِ زندگی

کو بے معنیٰ سمجھا۔ ویما کو دیکھ کر اعلیٰ طبقہ خطر آتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ

"وہ لوگ جو اپنے کو شائستہ اور با وقار سمجھتے ہیں ویما
کو دیکھ کو حیرت زدہ نظر آتے ہیں۔ خدا ہی کو صرف
اس کی انکساری معلوم ہے۔ اس پر بھی اس کے متعلق
یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی ہنسی اُڑاتا ہے"۔

ویما کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی باتیں شائستہ اور باعزت طبقے کو پسند نہیں آئیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ویما ان کے تہذیبی معیاروں کا قائل نہ تھا بلکہ ان کو تاکید کرتا تھا کہ وہ انسان بننے کی کوشش کریں۔ انکا گھمنڈ اور غرہ انسانیت کی تشکیل میں حائل تھا۔ قوت، سطوت اور وقار انسان کو انسان نہیں بناتی بلکہ انسان بننے میں خود انسان کی ذاتی جستجو اور کاوش درکار ہے۔ ان چیزوں کی کمی ویما نے انسانوں اور خاصکر اعلیٰ طبقے میں دیکھی تھی۔

ویما نے انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر غور کیا تھا۔ انسان کی زندگی حیاتیاتی قوتوں کے تابع ہے۔ صحت یا بیماری انسان کے جسم کی کیفیت ہی کو نہیں دکھاتی، بلکہ انسان کی ذہنی اور احساسی حالت کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ویما اس خیال کی تشریح یوں کرتا ہے کہ

"جب جسم بھلا چنگا ہو تو ہم کو ہمارا راستہ صاف دکھائی دیتا ہے، لیکن اگر جسم کمزور ہوجائے تو ہم اپنی اصلی حالت کو دیکھ نہیں سکتے۔"

وہ اس امر سے بھی خوب واقف تھا کہ زندگی کی قوتوں کا توازن بگڑنے سے انسان اپنی بے بسی کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ انسان کی بے خیالیاں اس کی بربادی کا باعث ہوتی ہیں۔ ویما کہتا ہے کہ

"دِیا تیل سے جلتا ہے لیکن اس میں اگر تیل نہ ہو تو بجھ جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری بے خیالی ہم کو غارت کردیتی ہے۔"

وہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ انسان کی زندگی من ملنے قانون کے تحت نہیں چلتی بلکہ تہذیب کا قانون ہے جو اس کو معنی خیز بناتا ہے۔ حیوانوں اور انسانوں کی زندگی میں جو فرق ہے وہ قانونِ تہذیب کا ہے۔ دنیا میں انسان اس غرض سے آتا ہے کہ آدمی بن سکے۔ آدمیت کی تہذیب اصولِ انسانیت سے ہوتی ہے، نہ کہ زندگی کی حیوانیاتی قوتوں کو فروغ دینے سے۔ ویما نے انسان کی جس بے خیالی کا ذکر کیا ہے اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان اپنے سے غافل ہوکر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور برباد بھی ہوجاتا ہے۔ ایسی انسانی ذہنیت اپنے تباہ کن اثرات کا کھیل انسان کی زندگی میں دکھاتی ہے۔

انسان کے زندہ رہنے سے یہ مراد نہیں کہ زندگی سال بسال کٹ رہی ہے بلکہ یہ کہ زندگی کی تربیت میں انسان عملی اور تعمیری حصہ لے۔

ویما کی خواہش یہ تھی کہ انسان اپنی اصلیت سے آگاہ ہوسکے تا کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے کے امتیاز کو معلوم کرنے کے بعد اپنی زندگی کا راستہ خود طے کرے۔ ویما کا یہ یقین تھا کہ اکثر لوگ اپنے سے نا واقف ہیں اور اپنے کو دھوکے میں ڈالے رکھتے ہیں۔ اپنی حدیں انسان کو معلوم ہونی چاہئیں۔ اس طرح اس کا گھمنڈ ٹوٹ سکتا ہے۔ اس کی ذہنی قدریں اس وقت تک تبدیل نہیں ہوسکتیں جب کہ وہ ایسا محسوس نہ کرے۔ ویما اپنے خیال کو یوں واضح کرتا ہے کہ

"انسان کو نہ اپنی پیدائش، نہ اپنی موت، نہ اپنی ابتداء اور نہ اپنے انجام پر قابو ہے۔ کیا یہ مذاق نہیں کہ انسان اپنے کو دنیا کا مالک سمجھے"۔

ویما کا یہ خیال خام نہیں بلکہ انسانی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ "دنیا کا مالک" اپنے کو یوں تصور کرنا جب کہ انسان کی زندگی بذاتِ خود ایک ایسے وہم پر چل رہی ہو مناسب نہیں ہے۔ زندگی کا بھید انسان کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ دنیا کا مالک

نہیں بلکہ مختلف قوتوں کا محتاج ہے۔ اس کو اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ اس کا رشتہ دنیا سے کن اصولوں کے تحت جڑ سکتا ہے اور اس کا مرتبہ دنیا میں کس نوعیت کا ہے!
پیدائش اور موت انسان کی ابتدار اور انجام کی منزلیں ہیں جن سے وہ گزرتا ہے لیکن جن پر اس کو قابو نہیں ہے۔
اپنی اصلیت سے غافل ہوکر انسان دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے لیکن وہ اس امر سے بے خبر ہے کہ اس کی زندگی اصولِ استوار پر قایم نہیں ہے۔ یعنی وہ خود ایک غیر فانی قوت کا معجزہ نہیں ہے اور نہ اس کی دینوی زندگی اٹل ہے۔ ویاؔ انسان کو یہ سمجھاتا ہے کہ زندگی بے کار شے نہیں بلکہ کارآمد ہے۔ زندگی میں لین ہوکر اپنی اصلیت سے بے خبر ہونا احمقانہ فعل ہے، کیونکہ وہ کسی کی ساتھن نہیں اور نہ کسی کی وفادار ہے۔ وہ وقت کے تابع ہے۔ زندگی کے اس روپ سے انسان خبردار ہوکر دنیا کے فرائض اور ذمہ داریاں ادا کرے۔ اس ذہنی کیفیت میں انسان کو دنیا میں رہتے ہوئے سکون حاصل ہوسکتا ہے۔
انسان کی دینوی محبت ویاؔ پر عیاں تھی۔ دنیا کے بندوں کے ساتھ وہ رہا تھا اور ان کی فطرت کا مطالعہ اس نے بغور کیا تھا۔ زندگی کی لذتیں، دولت کا نشہ اور

عشرت پسندی لوگوں کی زندگی میں کیا کیا گل کھلاتی ہیں وہ جانتا تھا۔ ویما ایسا انسان نہ تھا، جو انسانوں کو چھوڑ کر اپنی نجات کے راستے چلا ہو بلکہ انسانوں کے بیچ میں رہتے ہوئے اس نے انسانوں کی خبر لی اور ان کی بھلائی اور فلاح میں اپنی زندگی صرف کی۔ دینوی لوگوں کی ذہنیت کا خاکہ اس نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"دنیا میں تمام چیزوں میں سے کونسی چیز انسان کو زیادہ عزیز ہے۔ کہنے کو زندگی عزیز ہے، لیکن دولت کو ہزاروں زندگیوں سے عزیز تر سمجھا جاتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ دولت سے زیادہ عزیز ایک جوان لڑکی کے بول ہیں"۔

لوگوں کی زندگی کا مسلک یہی ہے کہ دنیا سے محبت کریں تا کہ دنیا کی ان چیزوں کو اپنے قابو میں لائیں۔ اسی میں زندگی کی کامیابی اور ترقی سمجھی جاتی ہے۔ ویما کے نقطۂ نظر سے انسانوںکی گمراہی کا راستہ اسی دینوی جستجو میں ہے۔ اس طرح انسان اپنی اصلیت سے بہت دور ہٹ جاتا ہے اور اس کی انسانیت اس کو چھوڑ دیتی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی ان کاوشوں پر غور اور فکر کرے۔ اپنے میں صلاحیت پیدا کرے کہ آیا دینوی طرزِ زندگی انسانی تہذیب کے راستے میں حائل تو نہیں ہے یا کیا انسان اسی لیے دنیا میں آیا کہ

وہ دنیوی زندگی کے شعار پر عمل پیرا ہوکر دنیا کے معیاروں کے خلاف لڑائی مول لے اور اپنے کو بہتر بنائے؟

ویما نے اپنے خیالات لوگوں کے سامنے اس غرض سے پیش کیے تھے کہ وہ ان پر غور کریں اور زندگی میں بھلائی کے خاطر تبدیلی کریں۔ مہذب انسان کے معیار دنیوی انسان کے معیار نہیں ہوتے ہیں۔ ویما کی دلی خواہش تھی کہ وہ لوگوں کو مہذب بننے کی تعلیم دے تاکہ انسان میں انسانی جوہر اپنا کام کریں۔ انسان کی تہذیب کا دارومدار زندگی کی لذتوں کے چٹخارے، دولت کی ہوس اور عشرت پسندی میں نہیں ہے۔ انسان کی زندگی میں ان چیزوں کی ایک حد ہوتی ہے۔ ان کا شمار زندگی کے مقاصد میں نہیں کیا جاتا بلکہ بحیثیت ذرایع زندگی کے ان کی اہمیت ہوسکتی ہے۔ دنیوی لوگ ان کو زندگی مانتے ہیں۔ اسی خیال کی تردید ویما نے کی تھی۔ زندگی کے سمجھنے اور اسکے فریب سے آگاہ ہونیکی تلقین ویما نے کی تھی۔

ویما نے انسانوں کی تقسیم کی تھی۔ اس کے نقطۂ نظر سے دنیا میں مختلف النوع انسان پائے جاتے ہیں۔ انسانوں کے مرتبے کی تقسیم دولت مندی اور غربت کی بنار پر نہیں بلکہ انسان کی تہذیبی منزلوں کے بموجب متعین ہے۔ ہر انسان کسی اونچ یا نیچ تہذیبی نہج کا نمونہ ہوتا ہے۔ دنیا میں

سب قسم کے انسان آباد ہیں ۔ ویماؔ کا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے انسانوں کی تہذیب بندی کے معیار کو قایم کیا ۔ اس نے انسانوں کی تہذیبوں کا جائزہ لیا اور بتایا کہ نیچ درجے کی تہذیب اعلیٰ اور اعلیٰ درجے کی تہذیب اعلیٰ ترین کس طرح بنائی جا سکتی ہے ۔ دنیا نے ویماؔ کو یہ دکھایا تھا کہ اعلیٰ انسان بگڑ کر ذلیل ترین اور ذلیل انسان سدھر کر اعلیٰ ترین ہو جاتا ہے ۔ انسان کو درحقیقت صحیح رہنمائی درکار ہے ۔ انسانوں کا یہ عالم ہے کہ

"وہ دیکھتے ہیں لیکن دیکھ نہیں سکتے ، سنتے ہیں لیکن سُن نہیں سکتے ۔ یہ کیا گھمنڈ ؟ یہ قول صداقت پر مبنی ہے کہ اندھے کی آنکھ ہوتی ہے اور بہرے کی ساعت"۔

انسان کی اس حالت پر غور کرتے ہوئے ویماؔ اس نتیجے پر پہنچا کہ غفلت اور بے خیالی انسانوں کی زندگی کو برباد کر رہی ہے ۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ زندگی کا تقاضہ کیا ہے ؟ جی لینا ہی زندگی سمجھتے ہیں ۔ دنیا میں رہتے ہوئے وہ دیکھ نہیں سکتے جب کہ دیکھتے بھی ہیں ۔ بالفاظ دیگر زندگی کے بھید سے ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ خود اپنے سے واقف نہ ہو سکے ۔ انسانی تہذیب کا پہلا سبق یہ ہے کہ انسان اپنے کو سمجھنے کی قابلیت پیدا کرے ۔ اس نے ایسا کر لیا تو اس نے سب کچھ پا لیا ۔ اس طرح انسان اپنی قسمت پڑھ سکتا ہے ۔ ویماؔ نے خوب کہا کہ

"جو ہماری قسمت کا ہے وہی ہمیں خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ جو کچھ ہم حاصل کرتے ہیں وہ اپنے ذاتی کردار کی بدولت، نہ کہ قسمت کی۔ برہما ہی مقدر کا مالک ہے اور ہمارے اعمال کے ذریعے سے ہماری بخشش یا سزا ہم کو مل جاتی ہے۔"

ویما نے انسان کی تہذیب پر زور دیتے ہوئے اس امر کو صاف کردیا کہ انسان کی قسمت کا فیصلہ انسان کے اعمال میں پوشیدہ ہے۔ انسانی ترقی اعمال کی تربیت ہے اور اعمال کی تربیت اسوقت تک ممکن نہیں جبکہ انسان اپنے سے آشنا نہ ہو۔ انسانی تہذیب انسان کے مرتبے کا تعین کرتی ہے۔ ویما کا قول ہے کہ

"دنیا کا سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو حق کو جانتا ہے۔ بُرائی کا چرچا صرف وہی کرتا ہے جو متوسط درجے کا انسان ہے اور سب سے گرا ہوا انسان وہ ہے جو اپنا پیٹ پالنے کی غرض سے مذہبی لباس پہنتا ہے۔"

عشرت پسند انسان کی زندگی کا معیار غیر تہذیبی ہے۔ ویما کا یہ کہنا کہ

"اس انسان کو جو عشرت کا متلاشی ہے مصیبتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ انتہائی خوشی کا حاصل کرنا اور ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنّا پوری ہونا اس کی قدرت سے باہر ہے۔"

عشرت پسند انسان اپنے انسانی مسلک کو ترک کر کے زندگی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ اس کے باوجود بھی اس نے زندگی کو نہ پایا۔ ویما کو عشرت پسندانہ زندگی سے کوئی ہمدردی نہ تھی بلکہ وہ سمجھتا تھا کہ گمراہی اس کی قسمت ہے۔ سکونِ قلب ایک عشرت پسند انسان کو کبھی نصیب نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس نے اپنی تہذیب اور تربیت نہیں کی۔ اسی طرح اس انسان کو ویما اچھا نہیں سمجھتا جو کسی کے احسان کا خیال و لحاظ نہ کرے۔ ویما کہتا ہے کہ

"ایک کتّا فطری طور پر احسان کو تسلیم کرتا ہے۔ انسان جو کسی احسان کو محسوس نہ کرے ذلیل ہے۔"

یعنی بے حس انسان در اصل مردہ ہے۔ تہذیبِ انسانی اس بات پر زور دیتی ہے کہ احسان کے ماننے سے انسان کی انسانی قوتیں زندہ ہوجاتی ہیں۔ احسان فراموشی انسان کش ہے۔

تہذیبی نہجوں کے مختلف انسانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ویما کہتا ہے کہ

"جو کہے کہ "میں کچھ نہیں جانتا" وہ سب سے سمجھدار ہے۔
جو کہے کہ "میں سیکھ رہا ہوں" وہ محض ایک بکواسی ہے۔
جو سکون میں ہے وہ دانشمند اور بہتر ہے۔"

تہذیب انسانی کے اعلیٰ معیار کو خودی کی بیداری میں ویمنا نے دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا ارشاد ہے کہ

"اپنے کو جان لینا ہی بڑی بات ہے۔ اگر ہم خود کو نہ جان سکے تو دوسرے ہمیں سکھا نہیں سکتے۔"

خودی کی بیداری انسان کو سچائی کی قدروں سے آگاہ کردیتی ہے۔

ویمنا یہ خوب جانتا تھا کہ سچ کی قدر دنیا کے لوگ نہیں کرتے کیونکہ ان کی زندگی فریب و مکر سے بھری رہتی ہے۔ تہذیبِ انسانی سچ کا پیام دیتی ہے اور انسان کو راست باز اور سچائی کے راستے پر چلنے کی ہدایت کرتی ہے۔ جو انسان سچ سے گریز کرتا ہے وہ اپنے سے گریز کرتا ہے اور اس کی زندگی الجھنوں کی گتھی بن کر رہ جاتی ہے۔ حق اور ناحق کی لڑائی انسان کی تعمیری اور اتحادی قوتوں کو فنا کر دیتی ہے۔ دنیا میں ناحق پنپتا ہوا دکھائی دیتا ہے، لیکن انسانیت کی بربادی اس کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ اس طرح انسان کا نفس غارت ہو جاتا ہے۔ سچے انسان دنیا میں پسند نہیں کیے جاتے ہیں۔ ویمنا بھی اسی خیال کو یوں پیش کرتا ہے کہ

"جو صاف کھری اور سچی باتیں کرتا ہے اس کو دنیا

میں سب برا سمجھتے ہیں"۔

جس طرح سچا آدمی لوگوں میں ہر دلعزیز نہیں ہوتا ہے ویسے ہی نیک انسان دنیا میں پوشیدہ رہتا ہے کیونکہ اس میں اور دنیوی انسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہمیشہ رہتا ہے۔ اس کے متعلق ویماؔ کا ارشاد ہے کہ

"دنیا میں ایسا وہ انسان نظر نہیں آتا جس کے دل میں نہ عورت کی خواہش ہو اور نہ دولت کی تمنّا ہو۔ اگر ایسا کوئی انسان دیکھنے میں آئے تو اس کی نیکی لوگوں سے چھپی رہتی ہے"۔

دنیوی ہوس سے مبّرا نیک انسان ہوتا ہے۔ دنیوی لوگ اس کی نیکی سے مستفید ہوسکتے ہیں، لیکن ان کے لیے وہ ایک بے سود انسان ہے کیونکہ نیک انسان کا معیارِ زندگی اور تہذیب عام دنیوی انسانوں کے لیے غیر دلچسپ ہی نہیں بلکہ ناقابلِ عمل بھی ہوتا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کا اصولِ زندگی بے معنی اور ہیچ ہے تہذیبِ انسانی کے لحاظ سے وہ اعلیٰ ہے۔ اس کے حاصل کرنے میں انسان کی ترتیبی قوتوں کی تشکیل مقدم ہے۔

ویماؔ کا تہذیبی معیار انسانی اصولوں سے ترتیب

پایا تھا ۔ انسان کے اعلیٰ بننے میں خود انسان کام کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ اس کو کوئی غیر انسانی قوت درکار نہیں ۔ وہ خود ایک زندہ ہستی ہے جس میں انسانی قوتیں پنہاں ہیں ۔ انسان خود اعلیٰ ہے ۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے انسانی جوہر سے آگاہ ہوتا جائے ۔ ویماؔ اعلیٰ انسان کے متعلق اپنے خیالات اسطرح واضح کرتا ہے ۔

"وہی انسان اعلیٰ ترین ہے اور تمام فرقوں سے بالاتر
جو ذاتوں میں غیر منصفانہ امتیاز نہیں کرتا"
یا
"تمام انسانوں میں اعلیٰ انسان وہ ہے جو سکونِ قلب
حاصل کرچکا ہو۔ وہ اپنے مذہب کا پابند ہے اور دوسرے
مذہبوں کو بُرا بھلا نہیں کہتا۔"

ویماؔ کے اس قول میں فلسفۂ انسانیت کوزہ میں بند کردیا گیا ہے ۔ اصولِ مساوات کی عینک سے وہی انسان اپنے ہمجنسوں کو دیکھ سکتا ہے جس کی زندگی ذات، فرقے اور قبیلے کی بندشوں سے آزاد ہوچکی ہو اور جس نے اپنے اور دوسرے میں انسان کی حیثیت سے فرق کرنا چھوڑ دیا ہو ۔

متمدن انسان دراصل اعلیٰ انسان ہے جس نے یہ

بھی محسوس کرلیا ہو کہ اس کے اور دوسروں کے مذہب
میں تصادم کا ہونا ناممکن ہے، کیونکہ مذہب کا بنیادی
اصول ہر مذہب میں یکساں ہے۔ ونیما کا یقین تھا کہ
اصلی مذہب انسان کی زندگی میں انسانیت کے جذبات
اور محسوسات پیدا کرتا ہے اور انسانوں کو انسانیت کے
رشتے میں منسلک بھی کرتا ہے۔ بعض یہ خیال کرتے
ہیں کہ دنیا کے مذاہب انسانوں کی زندگی میں فتنہ اور
فساد برپا کرتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری مذاہب پر عاید
نہیں ہوتی بلکہ ان افراد پر جو مذہب کا پرچار تعصب
انگیز پیرائے میں کرتے ہیں۔ مذہب کی اسپرٹ، انسانیت
کے اصول کے مدِ نظر اگر پیش کی جائے تو دنیا کے
مذاہب کے ذریعے انسانوں کے باہمی تعلقات میں ہم آہنگی
اور اتحاد قایم ہوسکتا ہے۔

مذہب در اصل اس راستے کا نام ہے جس پر چلنے
سے انسان خدا کو پہچان کر انسانوں سے میل پیدا کرتا
ہے۔ ونیما کا یہی کہنا تھا کہ اگر انسان اپنے مذہب
کا پابند ہے تو وہ کسی حالت میں بھی دوسرے مذہب والوں
کو بُرا نہیں سمجھتا اور ان سے نفرت بھی نہیں کرتا،
کیونکہ اس کی زندگی میں مذہب کی وجہ سے انسانیت

کے جذبات اور تخیلات ظہور میں آئیں ۔ ویما کے پیش نظر مذہبی انسان کا معیار درحقیقت اصولِ رواداری کا پیش خیمہ تھا ۔ بغیر مساوات اور رواداری کے انسان کا مذہبی بننا ممکن نہیں ہے اور نہ وہ اپنے مذہب کا سچا پیرو ہوسکتا ہے ۔ ویمآ کے تخیل میں جس اعلیٰ انسان نے جنم لیا تھا وہ خود ایک عالمگیر انسان تھا جو انسانی معیاروں کا ترجمان ہونے کے علاوہ ایک مذہبی انسان بھی تھا ۔

ویمآ کا انسان تہذیبِ انسانی کا حامل تھا اور اگر اس میں یہ اوصاف حمیدہ بھی موجود ہوں کہ اپنے دل پر قابو پاچکا ہو تو وہ بلا شبہ بہترین انسان ہے ۔ ویمآ اپنے اس خیال کی تشریح یوں کرتا ہے کہ

"جس نے آج یا کل اور پرسوں تک یہ سیکھ لیا ہو
کہ دل پر قابو کیسے پایا جاتا ہے وہ انسانوں میں
سب سے بہتر ہے" ۔

اپنے احساسات اور جذبات پر قابو پائے بغیر انسان کی تہذیب مکمل نہیں ہوتی ۔ اسی وجہ سے ویمآ کہتا ہے کہ

"بھوک کی آگ ، خواہش کے شعلے اور غصے کی تپش
سے اپنے آپ کو الگ رکھو ۔ تیری آزادی اِس

میں ہے کہ تو اپنی طبیعت میں تغیر نہ آنے دے"۔
اسی خیال کی توضیح اس نے یوں کی کہ

"ہم کو جسمانی اقامت گاہ سے نفرت کرنی چاہیے
کیونکہ پوست، کان، آنکھیں اور ناک کے توسط سے
پانچ محسوسات پیدا ہوتے ہیں اور ہم پر قابو پاتے
ہیں۔ دیکھ! تیری ہستی وہ ہے جو دنیوی رشتوں
سے الگ ہے۔ اے ویما! اس طرح تو خوش
رہ سکتا ہے"۔

ان دو مقولوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ویما انسان کو اپنے محسوسات کا غلام ہوکر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں انسان کی جیت نہیں بلکہ اس کی جیت اس میں ہے کہ وہ اپنے محسوسات پر حاوی ہو۔ انسان محسوسات کے کھیل کے لیے پیدا نہیں ہوا بلکہ ان پر فتح یابی حاصل کرنے کے لیے۔ اس میں انسان کی بڑائی ہے۔ یہی اس کی تہذیب کا اعلیٰ معیار ہے۔ ویما یہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان بالکل بے حس ہوجائے بلکہ محسوسات کو اپنے قابو میں رکھتے ہوئے اپنی زندگی کی تشکیل کے درپے ہو۔ اس طرح انسان اپنی انسانیت کی زندگی کو پہچان سکتا ہے۔ بے قابو محسوسات کے تابع زندگی

بسر کرنا انسان کی بربادی کی علامت ہے ۔ ویما کہتا ہے کہ

" انسانیت دنیا میں ناگزیر ہے، لیکن دانشمند انسان کی رسوائی اس کی مکاری ہے، کمینہ پن تباہی کا راستہ ہے اور دوسروں کے ساتھ بدنیتی اپنے کو برباد کر دیتی ہے"۔

ویما نے کامل انسان کی تعلیم دی تھی ۔ انسان کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ وہ انسان ہونے کی حیثیت میں کامل بن سکے ۔ کامل انسان ایک بھیدی انسان نہ تھا جس کی تہذیب ویما کے ہاتھوں ہو رہی تھی ۔ وہ درحقیقت گوشت اور پوست کا ایک عام انسان ہے، جو دنیا میں پیدا ہوا ہے ۔ اسی ہی کی تہذیب اور تربیت ویما نے کی تھی ۔ کامل انسان ایک عام انسان ہو سکتا ہے، جو اپنے اور دنیا کے رشتے کی گتھیوں کو سلجھاتا جائے ۔ اس طرح انسان کا دل و دماغ غلط فہمیوں اور پراگندہ محسوسات سے آزاد ہو کر انسانی زندگی کی پرداخت کر سکتا ہے اور انسان اس راستے پر لگ سکتا ہے جو دراصل کامل انسان کا راستہ ہے ۔ کامل انسان ویما کے نقطۂ نظر سے وہ انسان ہے جو جہاں دیدہ ہو۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نے دنیا اور انسان کے بھید معلوم کرلیے ہوں اور اپنی زندگی کے توازن کو قایم بھی کرلیا ہو۔ اسی وجہ سے ویماؔ کا یہ قول کامل انسان کے متعلق صادق آتے ہیں:

"وہ انسان کمال کے درجے پر پہنچ چکا ہے جو دن اور رات، عقل اور عالمگیر فطرت یا اپنے اور دوسرے میں امتیاز نہیں کرتا"

اور

"جو جان چکا ہو کہ تمام انسانوں کا انت لازمی اور موت یقینی ہے اور یہ جانتے ہوئے اس نے اگر خدا کے اوصاف پر دھیان رکھا تو وہ ایک کامل انسان ہے"۔

ویماؔ کا کامل انسان دراصل انسانی بزرگی کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"انسانوں میں صرف وہی بزرگی کے مرتبے کا مستحق ہے، جو یہ جانتا ہو کہ اس کا دل خدا کا گھر ہے۔ اپنے کو اگر تو جان لے تو خدا سے مل سکے گا"۔

دوسرا باب

انسانی برتری اور کمتری

دیما کی خواہش یہ تھی کہ انسان سماجی حقیقت سے آگاہ ہو کر انسانی زندگی کی قدروں کو سمجھے اور ان کی تشکیل کے درپے ہو ۔ جو سماج انسانوں کو انسان کی حیثیت میں دیکھنا اور رکھنا چاہتی ہے وہ دراصل ان کی تربیت اور نگہداشت کا حق رکھتی ہے ۔ دیما اپنے زمانے کی سماج کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ غیر اتحادی اور تفریقی قوتوں کا شکار ہو چکی تھی ۔ انسان کو مردہ اور بے حس بنانے میں اپنی تمام قوت صرف کر رہی تھی ۔ انسان کی مہذب زندگی کا تعلق کردار اور شخصیت سے نہ تھا ، بلکہ سماج کے امتیازی قوانین کے سانچے میں لوگ ڈھالے جاتے تھے۔

اس طرح عام زندگی کی بے حرمتی دنیا کی نظروں کے سامنے پھر رہی تھی۔ انسانی معیاروں کا تہس نہس ہو چکا تھا۔ انسان کی مجبوریوں کا وہ عالم تھا کہ سماج نے اس کو امتیازی بندھنوں میں جکڑ دیا تھا اور آزادی کا راستہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ انسان اپنی اس اصلیت سے بے خبر تھا کہ انسان ہونے کی حیثیت میں وہ کیا ہے کیا نہیں ہو سکتا تھا۔ سماج کے مقرر شدہ اصول اور ہدایت ہی اس کی زندگی کا سہارا بن چکی تھی۔ پیدائش سے موت تک اس کو ایک ہی راستہ طے کرنا ہی پڑتا تھا۔ سماجی قوانین اتنے سخت اور بے حس تھے کہ ان سے ہٹ کر زندگی بسر کرنا عام انسان کے لیے محال تھا۔ زندگی کی تہذیب کا سوال عام انسان کا سوال نہ تھا۔ طبیعت اور رجحان کے بموجب انسان اپنی زندگی کی تشکیل میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانے کے لوگوں کے دلوں میں سماجی یکجہتی اور ترقی کے خیال نے زور نہیں دکھایا۔ انکی سماج دراصل ان کے ذاتوں کی علٰحدہ علٰحدہ سماج تھی۔ ان کی اُنسیت اور وفاداری ہمہ گیر سماج سے نہ تھی بلکہ

اپنی ذات کے گروہ یا قبیلے سے۔ انسان بحیثیت ایک فرد کے ذات کا فرد تھا نہ کہ قومی فرد۔

اس انسانی بے ربطی اور بے اعتنائی نے ویمآ جیسے ذی فہم انسان میں سماج کے غیر انسانی روش و ضبط کے خلاف انسانی جذبات پیدا کیے کہ انسان کا انسانی مرتبہ سب سے مقدم ہے اور اس لیے انسانی حق کا مطالبہ واجب ہے۔ معاشرہ کے دباؤ اور زیادتی کی وجہ سے انسان کو گمراہ کردیا گیا تھا۔ اس میں انسان کے ذاتی فعل کا قصور نہ تھا، بلکہ سماج کے تنظیمی اصول نے اس کو غلام بنا دیا تھا۔ ویمآ کی یہ آرزو تھی کہ اہل ملک بلا تفریق مذہب و ملت انسانی حقایق سے آشنا ہوجائیں اور نئی زندگی کی داغ بیل ڈالیں، تا کہ ملک میں حقیقی انسانوں کی پرورش ہوسکے۔ ویمآ کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ مروجہ سماج کے طریقوں پر چل کر کیا انسان اپنی انسانیت کو بحال رکھ سکتا ہے یا ایک نئی عمومی سماج میں کیا اپنی کھوئی ہوئی انسانیت کو پا سکتا ہے؟

ویمآ ایک نصب العینی انسان نہ تھا۔ اس نے دنیا دیکھی تھی اور انسانوں کی فطرت سے واقف بھی تھا

اس کو اس بات کا رنج نہ تھا کہ انسان میں فطری کمزوری ہوتی ہے بلکہ یہ کہ سماج انسان کی ذلت وخواری کا باعث ہوتی ہے۔ اس کو انسانی مرتبے کی بے حرمتی کا بیحد قلق تھا۔ سماج کے خلاف جو لڑائی اس نے آدمیت کے اصول کے تحفظ کے لیے لڑی وہ اس زمانے کی ذہنیت کی تصویر تھی۔ سماج کے ظلم سے انسان کو آگاہ کرنا اور بچانا ویما کی زندگی کا مسلک تھا۔ آدمی زندہ اور آزاد ہے۔ اس نے اسی خیال کا پرچار کیا تاکہ لوگوں میں اپنی آدمیت کے متعلق نیا احساس پیدا ہو اور وہ ایک نئی سماج کی تشکیل میں ہاتھ بٹاسکیں۔ سماج انسان کی بربادی کے لیے اپنے نظام کو قایم نہیں کرتی بلکہ انسانوں کی آزادانہ زندگی میں سماج کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ اگر ایسا سماجی اصول کارگر نہ ہو تو انسان اپنی انسانیت سے کبھی آگاہ نہ ہوسکیں گے۔

ویما کا یقین تھا کہ وہ سماج جس کے قوانین ذات کی بنار پر وضع کیے گئے ہوں بیکار ہے کیونکہ ذات کا امتیازی قانون انسانوں میں فرق پیدا کرتا ہے، لیکن در حقیقت اس میں انسانوں کے مرتبے کے تعین کرنے کی قوت نہیں۔ اس خیال کی تائید میں وہ کہتا ہے کہ

"ذات کے متعلق، مناظرے کہ کونسی ذات بہتر ہے بے سود ہیں۔ تمام فرقوں کی ابتداء ایک ہی ہے۔ اس بات کا تصفیہ کون کر سکتا ہے کہ انسانوں میں برتر یا کمتر کون ہے۔"

ویما لوگوں کو سمجھاتے ہوئے یہ یاد دلاتا ہے کہ

"غور کرو کہ آیا ایک ذات دوسری سے بہتر ہے؟ سمجھ و فہم کے بغیر زندگی کا بسر کرنا بے معنی ہے۔ باسمجھ انسان کسی بھی ذات یا قبیلے میں پیدا ہو سکتا ہے۔"

ذات میں یقین رکھنا بیوقوفی کی علامت ہے کیونکہ

"ایسا انسان اپنی اینٹھ میں دوسروں کو اپنے برابر نہیں سمجھتا اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔"

اسی لیے کہ

"کل یگ کے دور میں لوگوں کا یہ تصور کہ تمام انسانوں کی شرافت ذات کی حد تک ایک ہے ممکن نہیں۔"

ویما کا خیال تھا کہ کل یگ میں دنیا کے لوگ نیکی اور راست بازی کے راستہ سے ہٹ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ لہذا ان کے لیے ذات بے معنی ہے۔ ممکن ہے کہ ویما ادارۂ ذات کی اہمیت کے متعلق یہ باور

کرانا چاہتا ہو کہ ذات لوگوں کو راست باز اور نیک چلن صرف ست یگ میں بنا سکی اور وہ کردار کی بنار پر ذات کے مرتبے پر پہنچے اور اپنی کرنی کے بموجب اپنا روحانی راستہ طے کرتے رہے۔

ذات کا تعلق انسانی کرم یا فعل سے بتایا جاتا ہے، لیکن ویما اس کل یگ میں ذات کی امتیازی اہمیت کو نہیں مانتا، بلکہ اس امر کو صاف کردیتا ہے کہ ذات کی وجہ سے انسانوں کی شرافت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ لہذا انسانوں کا یہ عقیدہ کہ ان کی زندگی کا دارو مدار ذات کے قانون کی پابندی ہے بیحد غلط اور لغو ہے۔ ویما ذات کے متعلق اس خیال کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ انسان ایک اعلیٰ ہستی ہے نہ کہ چھوئی موئی۔ وہ کہتا ہے کہ

"ملک، ذات اور کھانے سے ہمارے جسموں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لوگوں کا ذات کی وجہ سے تکلیف اٹھانا مضحکہ انگیز ہے۔"

ویما اپنے زمانے کے لوگوں سے خوب واقف تھا۔ اس نے یہ دیکھا کہ ملک کے جاہل ہی ذات کے پابند نہیں بلکہ اہل ہنر و علم بھی ذات پر یقین رکھتے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ

"تعلیم اور علم سے کیا حاصل اگر تو نے ذات کو بحال
رکھ چھوڑا۔ صحیح راستہ اختیار کرنے کے بعد بھی ذات
کے ترک کرنے میں لیت و لعل کرنا ایک ذلیل
فعل ہے۔"

دنیا کے لوگوں کا ڈھنگ دیکھ کر ویمنا تعجب کرتا
ہے کہ ایک طرف وہ ذات پر فخر کرتے اور اس کے
بل بوتے پر اکڑتے ہیں، تو دوسری طرف دنیوی اغراض
اور اعزاز کا لحاظ کرتے ہوئے ذات کے سماجی مرتبے
کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ ان کی انفرادی زندگی کی تشکیل
اور نشو و نما میں ذات کا حکم کام کرتا ہے، لیکن
دنیا داری برتتے ہیں۔ ویمنا کہتا ہے کہ

"پوتّر ذات، اعلیٰ نسل کے انسان اور اہلِ قلم
عام طور پر ایک امیر کی داشتہ کے لڑکوں سے
کمتر سمجھے جاتے ہیں"

کیونکہ لوگ دولت مندی کے مرتبے کو زیادہ وقعت کی نگاہ
سے دیکھتے ہیں۔ ویمنا کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی
کہ انسانیت کی قدر و منزلت دولت مندی کے مقابلے
میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ دولت مندی کے معیار

کو برتر سمجھ کر لوگ اپنے انسانی پیمانوں کو رد کر دیتے ہیں اور دولت مندی کے جھوٹے اور نا پائدار روپ سے اپنے کو متاثر ہونے دیتے ہیں۔

ویما نے انسان کی اس ذہنی اور احساسی کشمکش میں بربادی کے عناصر دیکھے۔ وہ کہتا ہے کہ

"لوگ اس انسان کی ذات نہیں پوچھتے جس کے گلے میں ہار، کانوں میں ترکیان، بدن پر زرین بندی ہو اور جس پر مٹاپا چھایا ہو بلکہ اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں"

لیکن ذات کا عمل و دخل اس انسان کی حد تک ضرور ہوتا ہے جو دولت مندی سے بہت دور مگر نیک کردار ہے۔ ویما نے اس خیال کو اس طرح واضح کیا کہ

"لوگ اس صوفی منش کی ذات دریافت کرتے ہیں کیونکہ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہے، کپڑے گندے ہیں اور اس کے جسم سے بو آتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ آگے جاؤ بابا۔ آگے جاؤ"

دنیا میں دولت مندی ذات سے بالا تر سمجھی جاتی ہے، لیکن غربت اور نیکی ذات کی نگاہوں میں بے معنی ہیں۔ اس خیال کی ترجمانی یوں کی گئی ہے کہ

"دولت مند بلا کسی امتیاز کے با عزت مانا جاتا ہے
اور جو کوئی اثاثہ نہ رکھتا ہو ذات میں گر جاتا ہے۔
اس طرح دولت کی منزلت ذات سے زیادہ ہوتی ہے۔"
ویماؔ ایسی سماج اور ایسی دنیا کا قائل نہ تھا بلکہ
اس کی یہ کوشش رہی تھی کہ ذات اور قبیلے کا ترک
کرنا انسان کی فلاح کے لیے ضروری ہے۔ اس کا
یہ یقین تھا کہ

"اگر ہم کائنات کا مشاہدہ اور اس کا مطالعہ
بغور کریں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ تمام ذاتیں
مساوی طور پر ظہور میں آئیں۔ اسی وجہ سے
تم سب ایک اور آپس میں بھائی بھائی ہو"

ویماؔ کے نقطۂ نظر سے ہمہ گیر سماج کی خصوصیت
اس کے انسانوں کی مساوات ہے۔ سماج اپنی اصلیت
کو کھو دیتی ہے اگر وہ مساوات کے اصول سے گریز کرے۔
ویماؔ نے اپنی زندگی میں انسانی مساوات کے اصول
کو محض تخیل کی حد تک پورا نہیں کیا بلکہ وہ خود اس
کا ایک زندہ نمونہ بھی تھا۔

ویماؔ نے یہ بتا دیا کہ انسان اپنی زندگی میں مساوات
کے اصول پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ یہی یقین اور

عمل دیمآ کا تھا ۔ انسانوں کی برادری کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ انسان میں ذات کا وہم، ذات کا گھمنڈ اور ذات کا احترام موجود ہے لیکن ذات کا طلسم ٹوٹ سکتا ہے ۔ اس بھید سے دیما بخوبی واقف تھا ۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سب انسان انسان کی حیثیت میں برابر کے ہیں اور آپس میں بھائی چارے کے رشتے میں منسلک ہو سکتے ہیں ۔ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ انکو زندگی کے نئے زاویۂ نگاہ سے آگاہ کرایا جائے تا کہ ذات کا بھرم ٹوٹ سکے ۔ دیمآ جانتا تھا کہ یہ بھرم کیسے توڑا جا سکتا ہے ؟ ۔ انسانوں کی برادری کا تخیل اسوقت تک ممکن نہیں جب تک کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ملکر نہ کھائیں ۔ اس خیال کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ

"دنیا کے سب انسانوں کے سامنے ایک کھانے کا
بھرا تھال رکھو اور سب کو ساتھ کھانے دو تا کہ
ذاتیں ٹوٹ جائیں ۔ ان کے سروں پر اپنا ہاتھ
رکھو اور یقین دلاؤ کہ ان کی تفریق لغو ہے" ۔

دیمآ نے ذات کے خلاف علم بغاوت اٹھایا تو

ضرور تھا، لیکن سماج کے مسئلے کے حل میں ایک اور بڑی دشواری درپیش تھی۔ سماج اپنی ذاتوں کے بل پر زندہ تھی جس کی بربادی کے درپے ویما تھا لیکن ہندوستانی دنیا میں ایسے لوگ بھی کثرت سے تھے جو سماجی مرتبے کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ ایسے لوگ دراصل خارجِ سماج سمجھے جاتے تھے۔ یہ سماج کے اچھوت تھے۔ انکی انسانی زندگی قابلِ رحم اور قابلِ ہمدردی تھی۔ گو انسان پیدا ہوئے تھے، لیکن انسان کی حیثیت سے انکو سماج میں کوئی درجہ حاصل نہیں تھا۔ لوگوں کی نظر میں وہ ذلیل تھے۔ انسانی حقوق اور خصائل کا سوال ان کے لیے پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ سماج کا یہ ظلم تھا کہ اس نے ان لوگوں کو ذات کے زمرے سے بھی باہر کردیا تھا۔

ویما نے سماج کی اس زیادتی کو محسوس کیا اور ان کی حمایت میں آواز بلند کی۔ وہ انسانونکا ہمدرد تھا۔ انسان سے اس کو محبت تھی۔ انسانی زندگی کی توہین ہوتے دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔ انسان کو انسان بنانا اور انسانیت کے تحفظ کے لیے لڑنا

اس کا کام تھا۔ عام لوگوں کی ذہنیت کہ اچھوت انسان نہیں دیبا کے دل میں غصے کی آگ کو بھڑکا دیتا تھا۔ اچھوت ایسا ہی انسان ہے جیسے دوسرے انسان ہیں۔ اس قوی یقین کے ساتھ اس نے انسانوں کی دھوکے کی نظروں کو چاک کردیا۔ اچھوت سے فطری ہمدردی رکھتے ہوئے اس نے اپنے خیالات کو ان الفاظ میں ادا کیا:

"تو ناپاک اور غلیظ ہے۔ مجھ کو نہ چھو!" وہ چیختے ہیں۔ ناپاکی کی حد کیا ہے؟ اس کا سرچشمہ کونسا ہے؟ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ناپاکی یہاں تک ہے اور یہاں تک نہیں؟ تمام انسانوں کے جسم ایک سے غلیظ ہیں۔ ناپاکی ہمارے ساتھ جسم میں پیدا ہوئی ہے۔"

دیبا کا یہ خیال تھا کہ اگر انسان پاک ہے تو سب انسان پاک ہیں اور اگر وہ غلیظ ہے تو سب غلیظ ہیں۔ اچھوت محض اپنی اچھوتائی کی بنا پر غلیظ نہیں کیونکہ وہ بھی انسان ہے۔ لوگ یہ سمجھتے تھے اور ہیں کہ اگر ان کو اچھوت چھولے تو وہ نجس ہوجاتے ہیں۔ اس کے متعلق دیبا یوں کہتا ہے کہ

"اگر اچھوت چھوئے تو پانی میں اپنے کو پاک کرنے
کی خاطر تم غوطہ کیوں لگاتے ہو؟ اچھوت خود اپنے
پرانے جسم کے گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہے۔ جو
یہ سمجھ نہیں سکتے احمق ہیں"۔

ویمنا نے اس خیال کو صاف کردیا ہے کہ اچھوت کی
پیدایش ہی اس کے لیے ایک سزا ہے۔ انسان کو یہ
حق نہیں کہ اس کو اچھوت کی حیثیت سے سزا دے
اور اس سے نفرت کرے۔ انسان کا کسی کو بھی بُرا
بھلا کہنا خواہ وہ شودر ہو یا اچھوت مناسب نہیں ہے۔
ویمنا یہ سمجھتا ہے کہ

"دنیا میں اس سے زیادہ بد بخت کوئی نہیں ہے
جو دوسروں کو بُرا بھلا کہے اور شودر سمجھے۔ مرنے
کے بعد اس کو جہنم نصیب ہوگا"۔

ویمنا انسانوں سے مخاطب ہو کر ایک سوال کرتا ہے۔
وہ یہ ہے کہ

"اچھوت کو ہمیشہ برا کیوں کہتے ہو؟"۔

اس کے جواب میں وہ خود کہتا ہے کہ

"کیا اس کا جسم و پوست ہمارے جیسا نہیں ہے؟
اُس ہستی کی کون سی ذات ہے، جو اچھوت اور

دوسرے انسانوں میں موجود ہے۔"

انسانوں میں اگر خدا کا نور ہے تو کیا اچھوت میں وہ نور نہیں ؟

ویما کا کہنا یہی تھا کہ لوگوں کا تخیل کہ خدا کا تعلق انسان سے ہے لیکن اچھوت کا انسان سے نہیں بے معنی ہے۔ کیا اچھوت کا خدا وہ نہیں ہے، جو انسانوں کا ہے ؟ ویما نے انسانوں کی ابتدار کے متعلق ایک سا پیام دیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ

"اچھوت کو دیکھ کر تو اپنی زبان سے اس کو ذلیل
کیوں کرتا ہے ؟ یہ محض تیرے ناشائستہ الفاظ ہیں۔
تجھے نہیں معلوم کہ اُس ہستی کی ذات کیا ہے جو
اچھوت میں بول رہی ہے" ؟

لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے ویما نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا کہ

"پیدائش کی بنار پر اچھوت کو ایک ذلیل انسان
نہ سمجھو ! جو اپنے وعدے کو توڑتا ہے وہ اس سے
بھی زیادہ ذلیل ہے، جو اچھوت پر لعنت وملامت
کرتا ہے، وہ اس سے بدتر ہے۔"

انسان کی ذلالت کا سوال ان کے گرے ہوئے کردار کا

سوال ہے نہ کہ پیدائش کا۔

ویما نے انسانی کردار کی تہذیب پر بہت زور دیا اور اس کا یقین تھا کہ انسان کی تہذیب اس کے اعمال میں زندہ ہوتی ہے یا مرجاتی ہے۔ انسان کی برتری یا کمتری اس کی اصلی تہذیب میں پوشیدہ ہے۔ انسانی خصائل کا ظہور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ ان کی قدروں کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ اسی وجہ سے اچھوت کا اور دوسرے انسانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ویما اپنے خیال کو یوں پیش کرتا ہے کہ

"اچھوت کے مثل ذلیل وہ انسان ہے جو اپنے قول
کو پورا نہیں کرتا۔"

اسی خیال کی مزید تشریح یوں کی ہے کہ

"جس کی زبان میں پاکیزگی نہیں پائی جاتی وہ
اچھوت سے کسی بھی حالت میں اچھا نہیں۔"

اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ

"گو پیدائش سے وہ اچھوت ہو لیکن اس نے اگر
اپنے دل کو سادہ لیا ہے تو وہ ہرگز اچھوت نہیں
ہے۔ جس نے اپنی خواہشوں پر قابو نہیں پایا وہ

ذلیل ترین انسان ہے۔"

ویما نے اس بات سے گریز نہیں کیا کہ انسانوں کو صاف طور سے یہ جتلا دے کہ اچھوت اور دوسرے انسانوں میں جو فرق ہے وہ انسانی پیدایش کا نہیں بلکہ انسانی اعمال کا۔ انسانیت کی تشکیل میں اچھوت بھی وہی درجہ رکھتا ہے جو دوسرے انسانوں کا ہے۔ معمولی انسان اچھوت سے بھی بدتر اور اچھوت اس سے بہتر ہو سکتا ہے اگر انسان کے جانچنے کی کسوٹی انسانیت ہو۔ لوگوں کو یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ انسان انسان پیدا نہیں ہوتا بلکہ بنتا ہے۔ سب انسانوں کی پیدائش ایک ہی سی ہے۔ انسانوں میں جو فرق ہے وہ ان کی تہذیب اور تربیت کا ہے۔ اسی وجہ سے ویما کا یہ خیال صداقت پر مبنی ہے کہ

"اچھوت اس کو نہ کہو جسکی طبیعت میں بھلائی ہو"

اور

"کسی انسان کے دل میں اگر اچھوتائی کے اصول جاگزیں ہوگئے ہوں تو پھر وہ اچھوت کو بُرا بھلا کیوں کہتا ہے؟"

یا

دو جنمی انسان کے لیے یہ کہاں تک واجب ہے
جب کہ ہر اچھی خصلت سے وہ مبّرا ہے؟"

لوگ اکثر اس امر سے بے خبر ہیں کہ گو وہ پیدایش کے لحاظ سے اچھوت نہیں، لیکن اپنے اعمال سے اچھوت یا شوودر ہیں۔ ویمؔا کا عقیدہ تھا کہ ایسے لوگوں اور اچھوت میں کوئی فرق نہیں اور نہ ان کو یہ حق حاصل ہے کہ اچھوت کی بے عزتی کریں۔ وہ کہتا ہے کہ

"اپنے آپ کو دو جنمی انسان سمجھتے ہوئے وہ
در اصل شوودر پیدا ہوئے، لیکن شوودر کو برا بھلا
کہتے ہیں۔ اپنے دو جنمی اعزاز پر فخر کرتے ہیں۔
اگر اب بھی انھوں نے اپنے دل پر قابو پانا
نہیں سیکھا تو وہ شوودروں کے شوودر ہیں"۔

برہمن پرستی سے انسان میں کوئی تبدیلی نہیں بلکہ اس کے دماغ میں نخوت پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی وجہ سے ویمؔا نے برہمن زدہ انسان کے متعلق یوں کہا کہ

"دو جنمی انسان اپنے جسم کی اصلیت سے غافل

ہے کہ وہ خون اور پوست کا مرکب ہے اور اپنے
دو جنمی اعزاز پر فخر کرتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ
موت اور دوزخ کی قوت کے اثرات سے وہ آزاد
رہ سکتا ہے؟"

یا

"کونسی سفید راکھ کے لگانے سے شراب کے برتن
کی بو غائب ہو جاتی ہے؟ کیا ایک تاگا جو تیرے
گلے میں پڑا ہے تجھ کو دو جنمی بنا دیتا ہے؟"

یا

"برہمن جب ایک خاص لباس پہن لیتا ہے تو اپنے
کو شودر تصور نہیں کرتا۔ کیا یہ تعجب کی بات
نہیں کہ جب وہ مرتا ہے تو اس کی برہمنیت بھی
برباد ہوجاتی ہے؟"

برہمنوں کے گھمنڈ کی ویما تاب نہ لا سکا۔ وہ کہتا ہے کہ
"زمین کے حاکم کہتے ہیں: ہم پاک ہیں، ہم
شاستروں کے ماہر ہیں"۔ دوسروں کی حالت
کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سچ تو
یہ ہے کہ ایک غریب ترین نیک انسان ان
شیخی خوروں سے بہتر ہے۔"

برہمنی زندگی کی پول کھولتے ہوئے ویما کہتا ہے کہ
"اپنے سے غافل ہوکر انسان دوسروں کی رہنمائی کیسے
کرسکتا ہے؟ وہ مارا مارا بیکار پھرتا ہے۔ وہ کسی
حالت میں بھی ایک وحشی سے کم نہیں اور پیسے
کی لالچ میں مذہبی رسموں کو ادا کرتا ہے۔"

تیسرا باب

انسانی امارت اور غربت

ویما کا تہذیبی معیار امارت اور مفلسی پر منحصر تھا بلکہ انسان پر ۔ اس کی تعمیر اصولِ انسانیت کے تحت ہوئی تھی ۔ ویما نے دنیا دیکھی تھی لیکن اس کے عمرانی معیار تسلیم نہیں کیے تھے ۔ دنیا میں اصولِ انصاف کا وجود نہیں ہے ۔ انسانوں کے مرتبے کا تعین دنیوی ہے نہ کہ اصولِ انسانیت نے ان کو مقرر کیا ۔ ویما نے بہت جلد یہ دیکھ لیا کہ انسانوں کی تفریق کا اصول بے معنی ہے ۔ لوگ امیر ہیں اور غریب بھی ۔ کیا اس تفریقِ انسانی میں دراصل کوئی اٹل اصول کام کر رہا ہے یا سماج کا نظام اصولِ امتیاز کو پیدا کرتا ہے ؟ ویما نے اس

سوال کا جواب نہیں دیا کیونکہ اس کے پیشِ نظر اس سے بھی زیادہ ایک دوسرا اہم سوال تھا۔ وہ یہ کہ امارت یا مفلسی میں انسانیت نشو و نما پاتی ہے یا نہیں؟ اس کو اس بات کے اقرار کرنے میں ذرا بھی تامل نہ تھا کہ انسانیت کا دار و مدار امارت پر نہیں بلکہ مفلسی بھی اس کو غارت کردیتی ہے۔

اپنے زمانے کے دولت مند لوگوں کی زندگی کا مطالعہ ویما نے بغور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ دولت مندی انسان کی زندگی کی تہذیب میں حائل ہے۔ انسان کے بنانے میں وہ رکاوٹ بن کر کام کررہی ہے۔ دولت مندی دنیا کی نظروں میں اعزازی درجہ رکھتی ہے مگر انسان کی تشکیل میں اس کا درجہ گرا ہوا ہے۔ دولت وہ سماجی قوت ہے جو انسانوں کو اپنے تحت لاتی یعنی انسان کو گرا کر اس پر حکومت کرتی ہے۔ انسان دولت کے نشہ میں چور ہو کر اپنی انسانیت کو برباد کرتا ہے۔ دولت مند کی کسوٹی دولت مندی ہے۔ وہ عام انسان کو نہیں خطرا تا مگر اپنے ہم دولت انسان کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ویما اس امر سے خوب واقف تھا کہ دولت مند

کے نظریۂ زندگی کی اہمیت کمتر ہے اور دولت مندی نے لوگوں کو بڑی حد تک نا کارہ کردیا ہے کہ وہ زندگی کے مسائل پر سوچنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ اسی وجہ سے ان کی زندگی دولت مندی کے باوجود بھی تکلیف دہ ہے۔ ویما کہتا ہے کہ

"جب وہ دیکھتے ہیں تو ان کو دکھتا نہیں کیونکہ وہ اپنی آنکھ نہیں کھولتے۔ جب وہ سنتے ہیں تو ان کے سننے میں لاعلمی حائل ہوتی ہے۔ دولت مند لوگوں کی یہی مصیبت ہے۔"

ویما دولت مندوں کے یقین کو جھٹلاتے ہوئے کہ دولت یا دولتمندی انسان کی زندگی سے دایمی تعلق رکھتی ہے اور وہ ان کی میت بھی ہے، کہتا ہے کہ

"اگر تو اپنی دھن دولت کے متعلق یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ تیری ہے تو تجھ سے صرف بیوقوف ہی اتفاق کرے گا۔ صرف وہی تیرا ہے جو تونے دوسرے کو دیدیا ہو۔ باقی پر تیرا کوئی لبس نہیں ہے!"

ویما نے یہاں اس امر کو صاف کردیا کہ انسان کی دھن دولت اس کی ساتھن نہیں، بلکہ دولت اگر

دوسروں کے کام آئے تو اس سے انسان ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ جو دولت کو اپنا سمجھتے ہیں اور دوسرے جو اس سے مستفید نہیں ہوسکتے دھوکا کھاتے ہیں

ویما کا کہنا ہے کہ

"آدمی ننگا پیدا ہوا اور ننگا رخصت ہوتا ہے۔ وہ (یعنی روح) جو اس کے جسم میں ہے دنیا میں ننگ پھرتی ہے۔ دولت مند انسان خواہ کتنے ہی دن زندہ رہے اس سے کوئی نیک کام نہیں ہوسکے گا" کیونکہ "انسان جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کی دولت اس کا پیچھا نہیں کرتی۔ دوسرے جنم میں وہ اس کے پاس نہیں جاتی ہے اور جب وہ دوبارہ مرجاتا ہے تب بھی اپنے ساتھ دولت نہیں لے جاتا۔ وہ کہاں جاتا ہے اور اس کی دولت کدھر جاتی ہے کس کو معلوم ؟"

دولت کے حشر کا ذکر کرتے ہوئے ویما نے دولت مند کو یہ باور کرایا کہ دولت مندی اس کی دائمی زندگی سے بے تعلقی رکھتی ہے، گو دولت مند اس گھمنڈ میں رہتا ہے کہ دولت ہی اسکی زندگی کا سہارا ہے۔

لیکن وہ اس بات سے بالکل بے خبر ہے کہ زندگی اور دولت کی دوستی کسی لمحہ بھی ٹوٹ سکتی ہے۔

ویما کا یقین تھا کہ دولت انسانوں کے کام آنی چاہیے، نہ کہ انسان دولت کے۔ وہ دولت کا مخالف نہ تھا بلکہ دولت مندوں میں احساس پیدا کرنا چاہتا تھا کہ ان کی دولت دولت مندی کے اعزاز کو ابھارنے میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دولت کے ذریعے انسانوں کی حاجت رفع ہونی چاہیے۔ یہی فریضہ دولت مندوں کا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ویما سمجھتا ہے کہ دولت مندوں نے اپنا اہم فرض ادا نہیں کیا اور ان کو اس وجہ سے کفارہ دینا پڑے گا۔ اس خیال کی وضاحت اس نے ان الفاظ میں کی ہے کہ

> "وہ بے حد دولت جمع کرتا ہے اور اس کو گاڑ کر رکھتا بھی ہے لیکن اس کے ہاتھ بخشش کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ آخر اس کو کفارہ دینا ہی ہوگا اور وہ بالکل برباد ہو جائے گا۔"

ویما کا یہ کہنا ہے کہ دولت مندوں کو اس بات کا خیال رہنا چاہیے کہ ان کی دولت مندی عارضی ہے۔

ان کی نخوت اور ان کا غرّہ دولت کی بنا پر لغو ہے۔ دولت مندوں کی ذہنیت کو یوں بیان کرتا ہے کہ

"دولت مندی کی حالت میں انسان کا سر پھر جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو دیکھ نہیں سکتا۔ مفلسی میں اس کے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں کہ دوسروں کو دے سکے۔ کیا انسان کی زندگی میں ایسا کوئی وقت آتا ہے جب کہ وہ دولت اور مفلسی کی برائیوں سے پاک ہو؟" اور "جو شخص اپنی دولت کے گھمنڈ پر اپنی قدر و منزلت کرتا ہے اور اپنی دولت مندی میں مست ہو کر دوسروں کو کچھ نہیں عطا کرتا وہ آخر برباد ہو جائے گا۔ اس کو اچھائی کبھی دکھ نہیں سکتی۔"

ویما انسانوں کو دولت مندی کے مسلک سے نفرت دلاتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہے کہ دولت اگر کوئی اہمیت رکھتی ہے تو وہ انسانوں کی فلاح اور بہبود کے لیے تا کہ دولت کی ہوس، دولت کا نشہ اور دولت کا زعم انسان کو برباد نہ کردے۔ دولت انسانی بھلائی کے لیے کام آنی چاہیئے نہ کہ

ظلم و تعدی کے لیے ۔ انسانوں کو آپس میں قریب تر
لانے میں دولت مفید ثابت ہو ۔ اس طرح دولتمند
انسان اپنی بھلائی کا راستہ ڈھونڈ سکتا ہے اور نیکیوں
کا اثاثہ جمع کر سکتا ہے ۔

ویناؔ نے جس طرح بے راہ دولت مندی میں
انسان کی بربادی دیکھی اسی طرح مفلسی میں انسان
کے اوصافِ حمیدہ کا نقصان دیکھا۔ اسکو دولت مندوں
سے کوئی ہمدردی نہ تھی بلکہ ان کی اندھی زندگی
ویناؔ کو مجبور کرگئی کہ وہ ان کے لیے بھی شمعِ ہدایت
بن کر ان کو دولت مندی کی گمراہیوں اور خطروں
سے آگاہ کرے، لیکن انسانی غربت کو دیکھ کر اس
کا دل تاب نہ لا سکا ۔ غربت انسانی زندگی کی وہ
کیفیت ہے جس میں انسان بجائے نشو و نما پانے
کے موت کے منہ میں جاتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس
کی وجہ سے انسان میں ہر انسانی خصلت پژمردہ
ہوجاتی ہے ۔ ایک غریب انسان اپنے میں انسان
کو محسوس نہیں کرسکتا ہے ۔ ویناؔ کا یقین تھا کہ
غربت انسان کو بے حس کر دیتی ہے ۔ تہذیب کی
نعمتوں سے وہ محروم ہوجاتا ہے ۔ اس میں نہ

اخلاقی، نہ مذہبی اور نہ انسانی قوتیں فروغ پاتی ہیں۔ ایسا انسان دنیا کی نظروں میں انتہا درجے ہمدردی کا مستحق ہے کیونکہ اس کی زندگی کی پس ماندگی اور بے حرمتی کا جواب دہ وہ خود نہیں بلکہ ہم نوع انسان اور سماج ہیں۔

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ "ایک غریب انسان ناقابلِ برداشت ہے" دینا نے ایسا محسوس کیا تھا کہ غربت کی وجہ سے انسان اس نوبت پر پہنچ جاتا ہے کہ لوگ اس کو "ناقابلِ برداشت" سمجھیں۔ اس غیر انسانی کیفیت کا دینا کو بے حد رنج تھا۔ غریبوں کے ساتھ انسانوں کی بے اعتنائی دینا کی آواز کو اور زیادہ بلند کرنے میں مدد دیتی رہی۔ غریبوں کی حمایت اور پاسداری کرتے ہوئے دینا ان الفاظ میں اپنا خیال ادا کرتا ہے کہ

"دولت کی کمی ذات کے مرتبے کو گرا دیتی ہے۔ انسان کی تمام شہوت کافور ہوجاتی ہے اگر اس کے پاس دولت نہ ہو۔ غریبی نفاست، صفائی یا پاکدامنی کو محو کردیتی ہے اور ان کے ساتھ ہی

شرافت کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔"

غربت انسان کی نفسیاتی اور احساسی زندگی کو میٹ دیتی ہے ۔ ان درد بھرے الفاظ میں وہ یوں کہتا ہے کہ

"غریبی انسان کے دل کو حقیر اور بے حس کردیتی ہے ۔ ایسے کو بھلائی کیسے نصیب ہوسکتی ہے، جو اتنا ذلیل و خوار کردیا گیا ہو۔"

ویمؔا ایک غریب میں صلاحیت نہیں دیکھتا کہ اس کی زندگی کبھی بھی بہتر بن سکے۔ وہ انسان پیدا ہوا، لیکن انسانیت کی منزلیں طے نہیں کرسکتا۔ اس انسانی خواری کا قلق ویمؔا کو بے حد تھا ۔ اس کے خیال میں ایک غریب انسان بچایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی انسانی فلاح میں ہاتھ بٹا سکتا ہے اور آدمیت کے درجہ اور مقام پر بھی پہنچ سکتا ہے ۔ غریبی سے اس کو نجات دلانا انسانوں کا کام ہے، ورنہ وہ اپنے انسانی فرائض سے محروم رہ کر غربت میں مرجائیگا۔ ویمؔا کے خیال میں غربت انسانیت کے خلاف گناہ ہے کیونکہ

"بھوکا ہر مذہبی حکم کو بھول جاتا ہے ۔ دل کی ساری صفائی تاریکی میں غائب ہوجاتی ہے۔"

اور

"غریب کی مصیبت صرف خدا ہی کو معلوم ہے۔ غریب کو دیکھکر جو اسکو انسان نہ سمجھے وہ مردے سے کم نہیں۔"

غربتِ انسانی، انسان میں انقلابی احساس پیدا کرتی ہے اور وہ غریبوں کی امداد کے احساس کا قائل بھی ہوجاتا ہے۔ ویماؔ نے غریبی میں انسان کی بربادی محسوس کی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ایک مرتبہ کہتا ہے کہ

— "جو مفلسی اختیار کرتا ہے وہ آیندہ فقیر پیدا ہوگا۔"

فقیری کو ویماؔ بہت ہی بُرا پیشہ سمجھتا ہے یعنی انسان اگر اپنی بربادی چاہتا ہے تو وہ مفلسی اختیار کرے۔ انسان پر غربت کی وجہ سے جو نفسیاتی و احساسی اثرات پڑتے ہیں، ویماؔ ان سے بخوبی واقف تھا۔ انسانی ہمدردی محض ذہنی ہمدردی کا نام نہیں بلکہ علمی ہمدردی انسان کو انسان سے اُنس اور محبت کے زندہ رشتے میں منسلک کرتی ہے۔ انسان ہی انسان کی مدد کرسکتا ہے اور اس طرح غریبوں کی حالت بہتر ہوسکتی ہے۔ غربتِ انسانی کے رفع کرنے میں

اگر انسان جستجو نہ کرے تو وہ اپنے ہم جنس غریبوں کی زندگی کو انسانی مرتبے پر لانے میں معاون نہیں ہوگا۔

ویمنا یہ خوب جانتا تھا کہ غریب غریب کی مدد نہیں کرسکتا ہے لیکن سماج کے وہ کھاتے پیتے لوگ اور بالخصوص دولت مند لوگ اس قابل اور اس حالت میں ہیں کہ وہ غریب کی دشواریوں اور مصیبتوں کو دور کرسکتے ہیں۔ ان میں احساس پیدا ہونا چاہیئے کہ وہ اس کار خیر کو انجام دیں۔ ویمنا کہتا ہے کہ

"دولت کس مصرف کی اگر اس سے غریب مستفید نہ ہو سکا" کیونکہ "بھوکے کو کھانا کھلانا ایسا ہی نیک کام ہے جیسا کہ قربانی کے وقت بھینٹ کا دینا۔ غریب کی حاجت کو رفع کرنا بہت بڑا ثواب ہے"۔

ویمنا غربا پروری کو قربانی جیسے نیک کام کے مماثل قرار دیتا ہوا اہل دولت کو غریبوں کے ساتھ عملی ہمدردی برتنے پر راغب کرتا ہے۔

غریبوں کے پالنے کا سوال ویمنا کے ہاتھوں میں اخلاقی رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ اپنے خیال کو وہ اسطرح

پیش کرتا ہے کہ

"دوسروں کو تکلیف نہ دینے کا خیال اتنا ہی نیک
ہے، جتنا کہ غریبوں کے پالنے کا"۔

اس خیال کی توضیح کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر آیا
کہ غریب کی داد رسی سے نیک انسان پروان چڑھتا
ہے۔ ویماؔ کہتا ہے کہ

"خواہ دولت اس نے اپنی جائداد سے کمائی ہو، یا
اسکو کسی رشتہ دار سے ملی ہو، یا کسی اور نے دی
ہو، وہی انسان نیک تصور کیا جائے گا جو فراخ دلی
اور محبت کے ساتھ غریبوں پر اپنی دولت خرچ
کرتا ہے"۔

غربا پروری کے جذبے میں وہ تاثیر ہے کہ انسان
اگر غریب کی خدمت کرے تو وہ لوگوں کی نظر میں
چڑھ جاتا ہے اور اس کی عزت دل سے کی جاتی ہے۔
غریب کی دست گیری انسان کو حقیر نہیں بلکہ باعزت
کرتی ہے۔ ویماؔ نے اسی خیال کو یوں ادا کیا کہ

"بیماروں اور محتاجوں کی غربت جو دور کرسکے گا
وہ اس زندگی میں عزت کے مرتبے پر پہنچ سکے گا"۔

ایسے لوگ نیک اور باعزت ہی نہیں سمجھے جاتے بلکہ

اہلِ دل بھی مانے جاتے ہیں ۔

"وہی کریم النفس کہلانے کا مستحق ہے جو غریب
اور مصیبت زدہ کی مدد کرتا ہے" ۔

دیما کے انسانی تخیل میں کریم النفس انسان کا بہت اعلیٰ مقام ہے ۔ غریب کی خدمت ، سرپرستی اور حمایت اوصافِ حمیدہ کے پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے ۔ دیما کا تہذیبی انسان اس طرح کے جذبات اور تخیلات سے بھرپور تھا ۔

چوتھا باب

زندگی کی تشکیل

انسان کی تہذیب ہو نہیں سکتی جب تک کہ وہ اپنی زندگی پر غور و خوض نہ کرے۔ انسان اپنی زندگی سے الگ نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی کے متعلقہ خیالات اور احساسات انسان کے بنانے اور بگاڑنے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ویما نے انسان کی تہذیب کرتے ہوئے اس کو اس بات سے آگاہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کا بھی جائزہ لے۔ دنیا کے لوگوں کا یقین ہے کہ زندگی کی تشکیل میں انسان کا ہاتھ اتنا نہیں ہے جتنا کہ غیر انسانی قوتوں کا۔ یعنی انسان اپنے بل بوتے پر نہیں بنتا۔ زندگی کی حفاظت اور

نگہداشت انسان کا کام نہیں ہے۔ انسان کا وہ عقیدہ کہ چند مخصوص رسمیں اور فرائض کے ادا کرنے میں اس کی زندگی خود بخود ٹھیک راہ پر لگ جاتی ہے، ایک خیالِ خام ہے۔ ویماؔ کہتا ہے کہ

"قسمت پڑھنا، شیطان اُتارنا، خوابوں کی تعبیر، لغو خواہشیں، دل خوشکن شگونی رسمیں تمام ایسی غیب کی باتیں سچ ہوتی ہیں اور جھوٹ بھی۔ پھر ان پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ لہذا انسان زندگی کے حقایق پر غور کرے اور ان کے سمجھنے کی کوشش کرے۔"

زندگی کے حقایق کی جستجو میں ویماؔ نے انسانوں کو ان کی بے خیالی سے آگاہ کیا کہ ان کا وجود محض جسمانی ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے اندر حیاتیاتی قوتوں کے علاوہ روحانی قوت بھی رکھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال کہ ان میں روح ہے کافی نہیں جب تک کہ وہ روح اور جسم کے باہمی تعلق کی نوعیت سے واقف نہ ہوں۔ اس یقین کی بناء پر ان کے نظریۂ اورعملِ زندگی میں گہری

تبدیلی ہو سکے گی ۔ جسمانی زندگی بے معنی ہے اگر روحانی زندگی سے انسان بے خبر رہتا ہے ۔ اسی وجہ سے ویما نے اس خیال کو یوں پیش کیا کہ

"جسم کو متواتر ہم پانی سے پاک کرتے اور دھوتے بھی ہیں ۔ اس کو خوراک دے کر پالتے اور کپڑے پہنا کر زینت دیتے ہیں ۔ اس کی خاطر ہم کتنی مصیبت اٹھاتے ہیں جبکہ یہ معلوم ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ فنا ہی ہوگا"

زندگی کے اس حشر کو لوگ جانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی انکی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ ویما بھی چاہتا تھا کہ وہ اس حقیقت کو محسوس کریں ۔ ان کی دنیوی محویت زندگی کی تہذیب میں مانع ہے اور وہ زندگی کی بھول بھلیوں میں اپنے کو کھو دیتے ہیں ۔ ویما انسان کے اس طرزِ زندگی کی مخالفت کرتا ہے۔

لوگ جس کو زندگی کی اصل مانتے ہیں ویما اس کو زندگی کا دھوکا کہتا ہے ۔ اس نے اپنا خیال ان الفاظ میں ادا کیا:

"بیوی اور بچے محض دھوکا ہیں ۔ خوشی اور رنج

سمجھ کا پھیر ہے۔ خاندان اور محبت کو ہم اصل
نہیں مانتے۔ تونے اپنی دھوکے کی زندگی کو کھوکھلے
خیالات سے بھر رکھا ہے۔"

انسان انھیں کو زندگی کی نعمتیں سمجھتا ہے، لیکن
دیما کے نقطۂ نظر سے ان میں اصلیت نہیں ہے۔ وہ
کہتا ہے کہ

"جس طرح پانی پر لکھا ہوا رہتا نہیں ہے
اسی طرح زندگی کی تمام نعمتیں غائب ہوجاتی
ہیں۔"

انسان کی عام ذہنیت ہے کہ وہ اپنے متعلق
یہ نہیں سونچتا کہ وہ کیا ہے اور کیا سے کیا
ہوسکتا ہے۔ اس کا سوچ بچار زیادہ تر دنیوی
معاملات کی حد تک رہتا ہے۔ اصل زندگی سے
بے اعتنائی کی وجہ یہ ہے کہ

"ہم اپنے آنے اور جانے یا اپنی موت پر
غور نہیں کرتے۔ ہم ان کو اٹل سمجھتے ہیں
اور بے سونچے سمجھے زندگی بسر کرتے ہیں۔
اس طرح ٹڈے کی مانند آگ میں کود پڑتے ہیں۔"

دیما کو حیرت ہوتی ہے کہ لوگ سکونِ قلب کی

اہمیت کو اپنی زندگی کی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں دیتے ۔ دنیا داروں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دنیا میں بہت کچھ ملا اور انہیں بھی لیکن سکونِ قلب ہرگز نہیں ملا ۔ اس کی تلاش ان کو دنیا میں چاروں طرف رہتی ہے اور سکون کا سایہ ان کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے، جس کو وہ دیکھ نہیں سکتے، لیکن ان کی زندگی میں ایک دن ایسا آتا ہے جبکہ وہ دنیا سے بیزار ہوتے ہیں اور سکونِ قلب کے حاصل کرنے میں ہاتھ پیر مارتے ہیں ۔ ان کی زندگی میں جب وہ وقت آتا ہے تو انسان سکون کے راستے سے بہت دور بھٹک کر گرا ہوا نظر آتا ہے ۔

دیما نے انسان کی اس بے چینی کو محسوس کیا تھا ۔ وہ کہتا ہے کہ

"جسم کی خاطر لوگ متواتر تکلیفیں اٹھاتے ہیں
جس میں ناپائیداری کے عناصر موجود ہیں لیکن
اس بات کی زحمت کوئی نہیں اٹھاتا کہ انتہائی
سکون کی حالت کو حاصل کرے"۔

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ

مایا کے دھوکے میں ہم گرفتار ہیں ۔ ہماری
خواہشیں ہماری زنجیریں ہیں ۔ ہمارے کھوکلے اعتبارات
ہمارے بندھن ہیں ۔ اس غلامی کی زندگی سے
کب نجات مل سکتی ہے ۔ انسان اگر اپنی زندگی
کو پُر معنی بنانا چاہتا ہے تو اس کو زندگی کے
بھید سے واقف ہی ہونا ہوگا ۔"
انسان کی زندگی کا راستہ یہ ہے کہ
"اگر تو زندگی کے اس بھید سے آگاہ ہے کہ
روح اور جسم کا میل عارضی ہوتا ہے تو تیرے
دل میں شک نہیں آسکے گا ۔ اگر تو خدا کو
جان لے تو تجھ میں حکمت چمکنے لگے گی کیونکہ
روشنی ہونے پر اندھیرا کافور ہو جاتا ہے ۔"

پانچواں باب

زندگی کی غیر انسانی تشکیل

ویما اس نظریۂ زندگی کا مخالف تھا جو زندگی کے تانے بانے کو توڑ کر اس کو منتشر کردے۔ زندگی کا نظام بیکار نہیں بلکہ کار آمد ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ لوگوں کی زندگی نئی ڈگر کی متلاشی ہو، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انسان زندگی کی تشکیل نہیں کرنا چاہتا غلط ہے۔ ویما کا مقصد یہی تھا کہ وہ انسانوں کو نئی راہ دکھائے اور ان میں نئے احساسات پیدا کرے تاکہ انسان کی انفرادی اور سماجی حیثیتوں میں اور زیادہ اضافہ ہوسکے۔ انسانی زندگی کو دنیا سے الگ کر کے بسر کرانا انسان میں غیر انسانی خصائل کو

فروغ دیتا ہے۔ ویما یہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ انسان میں خلاف انسانی یا غیر انسانی خصوصیتیں پیدا ہوں۔ انسان کو انسان بنانا اور انسان کو انسانی حیثیت دینا ویما کی تعلیم کا مرکزی خیال تھا۔

انسان دنیا میں رہتا ہوا بحیثیت غلام کے نہیں بلکہ ایک آزاد منش کے اپنی انسانی تہذیب کے راستہ کو طے کرسکتا ہے۔ دنیا انسان کی آزمائش کی جگہ ہے۔ اس کے بننے اور بگڑنے، اس کی کامیابی اور ناکامی، اس کی فلاح اور اس کے زوال کا تعلق دنیا سے ہے۔ ویما کا عقیدہ محض یہ نہ تھا کہ انسان کی روحانی زندگی میں دنیا حائل ہے۔

روحانیت کی لڑائی جو انسان کو لڑنی ہے اسی دنیا میں رہتے ہوئے لڑی جاسکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اور بالخصوص کامل انسان دنیا ہی میں تشکیل پاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے ویما نے اپنے خیال کو یوں پیش کیا ہے کہ

"ان کا مذہب جھوٹا ہے جو اس عقیدے کی تلقین کرتے ہیں کہ موجودہ زندگی کا تیاگ فائدہ مند ہے۔ کیا تم یہ دیکھ نہیں سکتے کہ

غیر فانی موجودات کا آغاز اس زندگی میں ہوتا
ہے۔"
اس طرح وِیما عالمگیر فطرت سے انسان کا رشتہ جوڑتا
ہے اور یہ محسوس بھی کراتا ہے کہ انسانی زندگی اور
دنیا میں ہم آہنگی ہے۔ اسی خیال اور احساس کے
تابع انسان دنیا میں رہتا ہوا اپنے کو اور دنیا کو
سمجھ سکتا ہے۔
دنیا کا ترک کرنا غیر انسانی فعل تصور کیا جاتا
ہے انسان جو ترکِ دنیا کے مسلک میں یقین رکھتا
ہے اپنی روحانی نجات کا راستہ دنیا میں زندگی بسر
کرتے نہیں دیکھتا۔ وہ دنیا کو چھوڑنا ضروری سمجھتا ہے
تا کہ روحانی کمائی کو حاصل کر سکے، لیکن وِیما ترکِ دنیا
کے خیال سے متاثر نہیں ہوا۔ اس نے تارک دنیا
لوگ دیکھے اور ان سے اچھی واقفیت بھی حاصل کی.
اس کو یہ محسوس ہوا کہ جس زندگی کے متلاشی وہ
نظر آتے تھے حقیقت میں وہ اس زندگی سے بہت
دور تھے۔ وِیما کے خیال میں ترکِ دنیا کرنے کی
وجہ سے ان کی انسانی تہذیب میں کوئی اضافہ نہ
ہوا۔ ترکِ دنیا کے تخیل اور عمل نے ان کی زندگی

کو کھوکلے نظریات اور تخیلات سے بھر دیا تھا۔ ایسے لوگ فقیر سمجھے جاتے ہیں، لیکن ان کا دل فقیری کے جذبے سے خالی ہے۔ ان میں انسانیت کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ جن چیزوں پر انھوں نے آقائی حاصل کی وہ فقیری کی ظاہری نشانیاں ہیں۔

ویما کو ان ظاہری نشانیوں کی اصلیت میں شک تھا۔ ویما فقیرانہ ذہنیت کا مخالف تھا۔ وہ کہتا ہے کہ

"وہ شہر اور زمین سے رخصت ہوتے ہیں۔
ان کے دل محبت اور اُنس سے خالی ہیں۔ ان
کے اطوار بیہودہ ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو
مصیبت میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟"

ویما ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے مفہوم کو نہیں سمجھا اور ان کی زندگی اکارت جارہی ہے۔ "ان کے اطوار بیہودہ ہیں" کے معنی یہ ہیں کہ ایسے لوگ دنیا کے سامنے جھوٹے معیاروں کو پیش کرتے ہیں۔ ویما یہ جانتا تھا کہ متمدن زندگی کا تشکیل پانا ایسے ذرایع سے ممکن نہیں اور نہ ایسے طریقے تعریف کے قابل ہیں۔ ویما سے رہا نہ گیا۔ وہ مجبور ہوکر اپنے خیال کو اس طرح

ادا کرتا ہے۔

" شہروں اور دیہاتوں کو چھوڑ کر بلا تکان محسوس کیے جنگلوں میں وہ پھرتا ہوا چلا جاتا ہے گویا یہ کوئی غیر معمولی نیکی ہے! جڑی بوٹی پر قناعت کرکے اس احمق کو نجات کیسے مل سکے گی "

یا

ایک دعاؤں کی کتاب! بٹی جٹائیں! شیر کی کھال! جھنڈا! تبرکات! وغیرہ وغیرہ صرف ان چیزوں کو اپنے ساتھ لے کر پھرنے کی وہ زحمت اٹھاتا ہے۔ یہ چیزیں اس کی نجات کا ذریعہ ہرگز نہیں بن سکتیں "

یا

منڈا ہوا سر اور سفید اونی لباس، بھبوت ملی ہوئی! ان کے جسم نفرت کے قابل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پیٹ پالنے کی غرض سے یہ تمام آرائش ہے "

یا

مخصوص الفاظ اور لباسوں سے سنیاسی واقف ہیں۔ گیروا لباس پہنتے ہیں اور سر گھٹواتے ہیں۔ ان

کو اسی پر ناز ہے ۔ ان کے سر بہت ہی صاف
معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے دل کیا ایسے
ہی ہیں ؟"

یا

" جو رنگین چوغہ پہنتا ہے اور بڑے درویشوں کی
نقل اس بات میں کرتا ہے کہ اس نے تمام
ظاہری خواہشیں ترک کردی ہیں در اصل ایک
فریبی سنیاسی ہے جس نے ایسی ترکیبیں اختیار
کرلی ہیں "

ویما فقیروں کے مختلف طبقوں کی حالت سے
بخوبی واقف تھا ۔ اس نے ان میں سوائے پاکھنڈ،
جھوٹ، فریب اور تصنع کے کچھ نہیں دیکھا ۔ ویما
یہ چاہتا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں فقیروں کی
جو عزت اور حرمت تھی اس کا بھانڈا پھوڑے اور
دنیا کو بتا دے کہ وہ لوگ احترام کے قابل نہیں
بلکہ ان سے دنیا کو نفرت کرنی چاہیئے ۔ یہ وہ
لوگ ہیں جو انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں اور اعلیٰ
زندگی کے معیار کو نقصان پہنچاتے ہیں ۔ ویما نے
فقیروں کو حقارت کی نظر سے دیکھا ۔ اس کا یقین

تھا کہ

"فقیروں کی پیشانیوں پر قسمت نے ان کے گناہ
لکھ دیے ہیں، جو کھانا اور لباس ترک کر کے
مندروں کے حجروں میں پڑے رہتے ہیں۔ اگر
وہ انسانوں سے واسطہ رکھیں تو ان کے رویے
میں کیا کوئی تبدیلی ممکن نہیں؟"

فقیر گناہ گار ہیں۔ انھوں نے تہذیبِ نفس اور
دل کے سادھنے کے طریقے نہیں سیکھے۔ اسی وجہ سے
نجات کے راستے سے ہٹ گئے، گو دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ وہ نجات حاصل کر چکے ہیں۔ ویما کو ان کے
اطوار دیکھ کر کامل یقین تھا کہ فقیرانہ زندگی قسمت
کی مار کی وجہ سے ان کو نصیب ہوئی، نہ کہ روحانی
تجلی سے۔ ویما ان کے متعلق کہتا ہے کہ

"ایسا انسان جس کے دل میں تہذیبِ نفس
کے جذبہ کا فقدان ہو لیکن محض اپنے گھٹے
ہوئے سر پر فخر کرتا ہو سب کچھ اپنے پیٹ
کے خاطر کرتا ہے۔ وہ بد طینت ہے۔"

اور

"اگر من سادہ لیا ہے تو فقیری کے زمرے میں

داخل ہونے سے کیا فائدہ ؟ ۔ اس بات سے
عالم بے خبر ہیں کہ دل ہی نجات کی بنا ہے۔

چھٹا باب

زندگی کا غلط راستہ

(یوگ)

صدیوں سے ہندوستان میں یہ خیال اور یقین چلا آرہا ہے کہ یوگ (ریاضت) زندگی کے ضبط میں لانے کا ایک بہت ہی اہم طریق ہے۔ یہاں تک کہ زندگی کی قوتوں پر کامل فتح یابی اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ یوگ کے قدیم دبستانوں نے انسان پر تحقیق تو ضرور کی اور دنیا کو یہ بتایا کہ انسان میں ایسی قوتیں پنہاں ہیں جن کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ یوگ کے راستے کٹھن بتائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہندوستان کی دنیا میں ان کو عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ یوگی اصل میں وہ ہے جو اپنی

جسمانی، ذہنی، قلبی قوتوں پر کامل طور سے حاوی ہو کر ان کے توازن کو اپنے میں قایم کر چکا ہو۔ دنیا کا عام انسان یوگی کی حیثیت میں ممکن نہیں کیونکہ جسمانی، ذہنی اور قلبی قوتوں پر قابو پانا یوگ کے بموجب کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود بھی ہندوستانی دنیا میں یہ خیال ہمیشہ زور پکڑتا رہا کہ یوگی ایک اعلیٰ ترین انسان ہے، جس نے زندگی پر فتح پائی ہے۔ جو شخص یوگ کے طریقوں پر چلتا ہے وہ اپنے میں یوگی صفات بھی ضرور رکھتا ہے، لیکن ہمارے ملک کی تمدنی، سماجی تاریخ شاہد ہے کہ اصلی یوگی اور یوگ کے طریقوں سے جن کو واقفیت تھی وہ مختلف ہستیاں ہیں، بعض مرتبہ بالکل متضاد بھی۔ یعنی یوگ کے مسلک سے بے خبر وہ ہیں جو یوگ کے طریقوں کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں لیکن وہ یوگی کہلانے کے اس اعتبار سے مستحق نہیں ہیں کہ انھوں نے زندگی پر قابو پالیا ہو۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ عام یوگیوں کی نظروں کے سامنے سے وہ مسلک جو یوگ زندگی کی فتحیابی کی حیثیت سے

پیش کرتا تھا غائب ہو چکا۔ ایسا ممکن ہے کہ ملک میں چند گنتی کے یوگی ایسے ہوں جو حقیقت میں یوگ کے ذریعے نجات حاصل کر چکے ہونگے۔ ایسی یوگی ہستیاں دنیا سے پوشیدہ رہتی ہیں لیکن عام طور پر یوگی جو دکھائی دیتے ہیں دنیوی یوگی ہیں جو اپنے اور دوسروں کو برابر دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ ایسے یوگیوں سے دنیا کو کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ انسانوں کی گمراہی اور بربادی ان کے ہاتھوں ہوتی ہے۔

ویماؔ نے اپنے زمانے کے یوگی اور تپسوی دیکھے لیکن ان سے وہ متاثر نہیں ہوا کیونکہ ان میں زندگی کے حقایق کی تڑپ اور بے چینی نظر نہیں آتی تھی۔ کہنے کو تو وہ ریاضت کی کڑی زنجیروں میں اپنے آپ کو باندھے ہوئے تھے، لیکن دل کی ریاضت سے محروم تھے۔ ویماؔ کہتا ہے کہ

"کل یگ کے لوگ نجات حاصل کرنے کی
صلاحیت نہیں رکھتے۔ جسم کو کڑے تپس کی
آگ میں ڈال کر وہ اپنے کو فضول تکلیف
دیتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ حق سے

بے خبر ہیں۔"

ان کی زندگی کا یوگ در حقیقت کرتبی اظہار زندگی ہے۔ اسی وجہ سے ویّما تاکید کرتا ہے کہ

"قاعدے کے بموجب اپنی ٹانگیں اور باہیں موڑتے ہیں اور اپنے جسم میں سانس بھر کر روکتے ہیں۔ بعض مرتبہ رینگتے اور پھر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ مذہبی اٹھنے بیٹھنے کے طریقے محض کرتب ہیں جو سیکھے جاسکتے ہیں۔"

دنیوی یوگی کی تصویر ویّما نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:

"بدبخت تپسوی اپنے پیٹ کو باہر نکالتا، اپنی آنکھوں کو گھماتا اور اپنے تمام جسم سے لڑتا ہے۔ اس کی حالت اس بھیڑ سے بہتر نہیں جو قربانی کے لیے جارہی ہو۔"

لوگوں کو ویما نے اس بات کی ہدایت کی کہ تپسوی کی زندگی اس قابل نہیں کہ اس کی تقلید کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ

"ان گھمنڈی فقیروں کی طرح نہ بنو جو یہ خیال کرتے ہیں کہ نجات کا راستہ مختلف آسنوں

کے ساتھ سانس کے نکلنے ، اندر رکھنے اور پھر
نکال دینے میں ہے۔ دل کی آنکھ کھلے بغیر
خدائی کے متعلق زبانی جمع خرچ محض نخوت
ہے۔"

اور

"مختلف آسنوں اور جوڑوں کے توڑ مروڑ کو
اگر مذہب سمجھا جائے تو پہلوان کے داؤں پیچ
سے بھی وہ گرے ہوئے ہیں۔"

اس سے یہ ظاہر ہے کہ یوگیوں اور تپسویوں کی
یوگتائی جسمانی حیثیت سے بھی اپنے میں کوئی خوبی
نہیں رکھتی حالانکہ روحانی برتری کی منزل کا
وہ مرکز تصور کیا جاتا ہے۔ دیما کی انسانی تہذیب
کے مطمح نظر سے یوگ ناکارہ ثابت ہوا۔ لہذا
اس کا ارشاد ہے کہ

"فریبی تپسوی اپنے دل کو دھیرج دینے کی
صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ اس کے خیالوں
میں عورت (دنیا) بسی ہوئی ہے۔ اس کی
زندگی کتنی بے سود ہے۔ وہ کس لیے پیدا ہوا۔"

ساتواں باب

زندگی کے بندھن

(رسم پرستی)

عام طور پر خدا کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ انسان کی مذہبی زندگی کی نشو و نما میں رسم پرستی ہمیشہ حائل ہوتی ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ انسان رسم پرستی میں پھنس کر اسی کو خدا پرستی سمجھنے لگتا ہے۔ دنیا اس کی شاہد ہے کہ رسم کے پرستاروں اور خدا پرستوں میں دن اور رات کا فرق ہے۔ رسم پرستی انسان میں جمود کا عالم پیدا کرتی اور خدا پرستی انسان میں انسانیت کی قوتوں کو زندہ کرنے میں مدد دیتی ہے

ایک میں انسان کھو جاتا ہے اور دوسرے میں
وہ اپنے آپ کو پا لیتا ہے۔

عام لوگوں کا یقین ہے کہ مذہب بغیر رسم پرستی
کے مانا نہیں جاسکتا۔ رسم پرستی مذہب کی شکل ہے
لیکن "خدا پرستوں" نے رسم پرستی کو بیکار نہیں بلکہ
لغو سمجھا۔ انسان کی رسم پرستانہ زندگی روحانیت
کے جذبات سے مبرا ہوتی ہے، کیونکہ رسم پرستی
اور روحانیت یا وحدانیت میں میل ممکن نہیں ہے۔
انسان کے دل کی آنکھ روحانیت سے کھلتی ہے
اور رسم پرستی دنیا داری سکھاتی ہے، گو لوگ اس
کو مذہبی فرض کی ادائی سمجھتے ہیں۔ رسم پرستی کی
بناء پر انسانوں میں تفریق کے جذبات پیدا کیے
جاتے ہیں، لیکن خدا پرستی انسان اور انسان میں
بلا تفریقِ مذہب و ملت اتفاق اور اتحاد پیدا
کرتی ہے۔ لوگوں کی زندگیوں میں مذہب کی وجہ
سے جو فرق ہے اس کی ذمہ داری "مذہبی
رسم پرستی کے مختلف" عقاید" ہیں نہ کہ مذہب کا
عالمگیر اصول۔ دنیا کے مذاہب کا بنیادی اصول
خدا پرستی ہے لیکن ان کی رسم پرستی نے اہلِ مذہب

کے دلوں میں نفرت اور پھوٹ پیدا کردی ہے۔
مذہب پر غور کرتے ہوئے ویما بھی اسی نتیجہ
پر پہنچا تھا کہ خدا پرستی انسانی وحدت یا یکتائی
کے اصول کو زندہ کرتی ہے اور رسم پرستی انسان
کو گمراہ اور خراب ہی نہیں بلکہ انسان اور انسان
کے درمیان فرق پیدا کرتی ہے۔ انسان کی بھلائی
کا راستہ رسم پرستی نہیں ہے کیونکہ اس راستہ
پر چل کر وہ نیکی کما نہیں سکتا اور سکونِ قلب
اس کو حاصل نہیں ہوتا۔ ویما کہتا ہے کہ

"تیری بے شمار مذہبی رسمیں محض جال کے پھندے
ہیں۔ روح کے بندھن کے توڑنے میں ان
سے تجھے مدد نہیں ملتی۔ وہی بزرگ آزاد
ہے جو ان کو توڑ چکا ہو"۔

ویما کے خیال میں رسم پرستانہ ذہنیت یا طرزِ زندگی
انسان کی روحانی غلامی کا باعث ہوتی ہے۔ اسی
خیال کو وہ دوسرے طریقے سے ادا کرتا ہے:

"کوئی انسان بزرگی کے درجے پر اس وجہ
سے نہیں پہنچتا کہ اس کا سر گنجا ہے یا اس
کی جٹائیں بٹی ہوئی ہیں یا اس نے بھبوت

لگا رکھی ہے یا وہ ایک واعظ ہے یا وہ آسن
جمانا جانتا ہے یا وہ مذہبی لباس پہنتا ہے۔
اس کے لیے باطن کی صفائی لازمی ہے۔"

مذہبی دنیا کی رسمیں اور مذہبی علمبرداروں کے طریقے اس کو پسند نہ تھے۔ ان میں اس کو فریب کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ انسان کے بننے کا طریق وہ نہیں ہے جو عام لوگوں کا ہے۔ انسان کی تہذیب مادیت میں نشو و نما نہیں پاتی بلکہ روحانیت میں پروان چڑھتی ہے۔ لوگوں کا رسم پرست عقیدہ" ویما کی آنکھوں میں مثل خار کھٹکتا تھا۔ اس کو بے حد افسوس اس بات کا تھا کہ رسم پرستی نے لوگوں کو بے حس اور مردہ کردیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ

"جسم پر مقدس راکھ لگا کر کیا تو اپنے کو
بہتر بنا سکا؟ تیرا خیال صرف خدا ہی پر ہونا
چاہیئے ورنہ ایک گدھا بھی خاک میں لوٹ سکتا
ہے اور تو بھی۔"

رسم پرستی سے انسانوں کے امتیازی مرتبے کا تعین بھی ہوتا ہے، لیکن ایسے طریقے انکی گمراہی کا ذریعہ ہیں۔ ویما نے اپنے اس خیال کو یوں

پیش کیا ہے کہ

"مقدس راکھ سے تمھارے جسموں کی لیپا پوتی
تمھارے بازؤں پر یہ فرقہ وارانہ اعزازی نشانیاں
اور مورت کا تمھارے گلوں میں لٹکنا مختصراً
تمھاری تمام عقیدتیں محض اس دنیا کے لیے
ہیں نہ کہ تمھاری عاقبت کے لیے۔"

ویما کا یقین تھا کہ رسم پرستی کی وجہ سے انسان اپنی عاقبت سے بے خبر ہوگیا ہے۔ دنیا دارانہ عقیدتیں عاقبت میں کام نہیں آتیں اور نہ انسان کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ اپنی عاقبت اچھی کر سکے۔ اس سلسلے میں ویما نے مذہبی رسموں کو بیکار اور لغو سمجھتے ہوئے یہ کہا کہ

"اپنے بزرگوں کے لیے کھانا" اس کو تم کہتے
ہو لیکن بڑے انہماک سے کوؤں کو بلا کر وہ
کھانا کھلاتے ہو۔ اے رسم پرستو! کوؤں کے
ساتھ سخاوت کے کیا معنی؟ مسکین لوگوں کو کھلاؤ
تو بہت بہتر ہے۔"

اسی خیال کی توضیح کرتا ہوا وہ کہتا ہے کہ

"اے گدھو! تم کھانے کی گولیاں کیوں بناتے ہو

اور اپنے بزرگوں کے نام لے لے کر کوؤں کو
کھلاتے ہو ۔ ایک گوبر کھانے والا کوّا تمھارا بزرگ
کیسے ہوسکتا ہے؟"

ویمنا نے رسم پرستی کی انتہائی حماقت کو ان خیالات
میں پیش کیا ہے کہ

اس کی پیشانی ایک پرستار جیسی ہے ، لیکن
اس کا منہ بھیڑیے جیسا اور اس کا دل
گردشی پریت ۔ کیا وہ انسان اتنا بے شرم
ہوگیا جب کہ وہ کہتا ہے کہ اس نے خدائی
جان لی ہے"

رسم پرستی خدا پرستی کی جڑ کو کھوکھلا کردیتی ہے۔
اسی وجہ سے ویمنا کہتا ہے کہ

خدا ہمارے ملک یا لباس کی قدر نہیں کرتا
ہے ۔ وہ ہماری روح میں موجود ہے۔ خدا
اور روح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں
صرف پیٹ کے لیے دکھاوٹی لباس پہنا جاتا ہے

اور

پیدایش اور موت کے وقت نہ روز کی دعائیں
تھیں اور نہ زنّار تھا"

ویماؔ کا یقین تھا کہ رسم پرستانہ عقیدت انسان کی زندگی میں توہمات کو بڑھاتی ہے، کم نہیں کرتی۔ ایسی زندگی پرستش کے کم تر درجے کو پیش کرتی ہے۔ ویماؔ نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے کہ

"توہماتی رسمیں اور آسن جما کر بیٹھنا سب سے نیچے درجے کی پرستش ہے۔"

انسانی زندگی کی تشکیل میں رسم پرستی رکاوٹ ہے، رسم پرستی انسان کی دشمن ہے اور اس کو غارت کرتی ہے۔

آٹھواں باب

زندگی کی گردش

(جاترا)

دنیا کے لوگوں کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی میں تیرتھ جاترا کریں تو ثواب کما سکتے ہیں۔ اسی عقیدت کی بناء پر دنیا کے لاکھوں انسان تیرتھ جاترا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا اہم مذہبی فرض ادا ہوگیا۔ بعض تو یہاں تک یقین کرتے ہیں کہ ان کے گناہ بھی تیرتھ جاترا کے بعد دُھل گئے اور وہ نیک بن گئے ہیں۔ مقدس مقامات کے درشن کر لینے سے ان کی روحانی ترقی کے دروازے

کھُل جاتے ہیں، لیکن دنیا کے اصلی بزرگوں کا خیال اور یقین ایسا نہ تھا۔ انھوں نے تیرتھ جاترا کے مقاموں میں اس زندگی کو دیکھا تھا جس سے انسان کے دل میں نفسیاتی نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں تیرتھ جاترا کے مقام خدا کے گھر نہیں بلکہ شیطان کے ہیں ۔ ان مقاموں میں انسانی زندگی کی بے حرمتی اور ذلت ہندوستان کے بزرگوں نے دیکھی تھی ۔ ایسے مقاموں میں انسان کی روحانی نشو و نما کے بجائے اس کی زندگی میں رسم پرستانہ مادیت مذہب کے روپ میں کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ مذہب کا پاکھنڈ اور پروہت کی رچائی ہوئی لیلا کے مظاہر نظر آتے ہیں ۔ ایسی تیرتھ جاترا کی دنیا میں انسان اطمینانِ قلب حاصل کرے تو کیسے ؟

ویماؔ نے ایسا ہی محسوس کیا تھا ۔ اس کے خیال میں تیرتھ جاترا کرنا انسان کی نفسیاتی الجھن کی علامت ہے۔ اگر اس کی یہ نفسیاتی خامی دور نہ ہوئی تو وہ اپنی اسی الجھن میں ہمیشہ پھنسا رہے گا ۔ ویماؔ نے انسان کی جاترائی ذہنیت

پر کافی غور و خوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کی اُنتی تیرتھ جاتراؤں میں نہیں ہے۔ تیرتھ جاترائی عقیدت ہے اور انسان کی نفسیاتی زندگی کی نشو و نما میں خلل پیدا کرتی ہے۔ ویمنا یہ سمجھ گیا تھا کہ

"گو انسان کاسی، مدورا کانجی ورم، گیا پریاگ اور سیتو کے مقدس مقاموں کی جاترا بڑی سر گرمی سے کرتا ہے لیکن اس کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ محض درد سری ہے۔"

انسان کی تہذیب میں تیرتھ جاترا کام نہیں آتی بلکہ وہ اپنے کو فضول تکلیف دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ویمنا یہ کہتا ہے کہ

"مقدس پانی میں کس مقصد کے حصول کے لیے تم ڈبکی لگاتے ہو۔ مقدس مقاموں کو جا کر کیوں چھو آتے ہو؟ خدا کی پرستش کی کوشش کیوں کرتے ہو جب کہ تمھارے دل گندے خیالات سے بھرے ہوئے ہیں۔"

یا

"گو بنارس کا مقدس پانی تم اپنے ہمراہ لیے پھرو، گردش کی تپش سے تمھارے پیر اور چہرے سوج بھی جائیں لیکن تم سکون سے محروم رہوگے ۔ موت کے بعد تم کو ان ذرایع سے نجات کس طرح مل سکتی ہے؟"

یا

"اس خیال کا چرچا کیوں کیا جاتا ہے کہ "میں کاسی جاؤں گا"؟ مقدس چشموں کی زیارت کی خواہش دل میں کیوں پیدا ہوئی؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک بدکار کو بنارس سے (نجات) حاصل ہو سکے؟"

یا

خواہ تم ملک ملک پھرو، تمھارے دل میں مذہب کیسے جگہ کر سکتا ہے ۔ بھیک کی خاطر پھرتے رہنے سے نجات کیا مل سکتی ہے؟"

یا

"اگر ایک ترک تری بینی کی مقدس پہاڑی کو چلا جائے تو کیا وہ حاجی ہو جائے گا ۔ بنارس

کی جاترا کیا ایک طوائف کو با عصمت بنا سکتی ہے؟"

یا

"اگر کوئی کتّا کوکن ہوکر واپس آجائے تو کیا وہ کتّا نہیں رہتا اور شیر بن جاتا ہے؟ سؤر بنارس کی جاترا کے بعد کیا ہاتھی ہوجاتا ہے؟ اسی طرح وہ انسان جس کی فطرت بد ہو کیا تیرتھ کے بعد بھگت ہوسکتا ہے؟"

ویہا اس امر کو صاف کردیتا ہے کہ تیرتھ جاترا سے انسان کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں آتا اور جب تک انسان کے دل میں میل اور کدورت باقی ہے وہ چاہے کتنی ہی مرتبہ جاترا کر آئے اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کی بری فطرت انسان کی تہذیب میں مانع ہے۔ اس طرح وہ اپنی انسانیت کو ترقی نہیں دے سکتا۔ انسان کی ایسی حالت نفرت کے قابل اور افسوس ناک ہے، کیونکہ وہ اپنی آدمیت کے سدھار میں کوشش نہیں کرتا بلکہ اپنے کو بھول کر نجات کی تلاش کرتا ہے۔ اس کو اس بات سے آگاہی نہیں ہوئی کہ مذہبی

زندگی کا تعلق اس کے قلب کی تشکیل اور تہذیب
سے ہے۔ یہاں تک خدا پرستی کا گھر بھی انسان
کا دل بتایا گیا ہے۔

خدا کو بالخصوص مقدس مقاموں میں ڈھونڈنا
انسان کا احمقانہ فعل ہے۔ ویما کہتا ہے کہ
"بنارس بنارس وہ چلاتے ہیں اور وہاں جانا
پسند کرتے ہیں۔ کیا وہ خدا جو وہاں ہے یہاں
نہیں؛ اگر تیرا دل صاف ہے تو وہ یہاں
بھی ہے اور وہاں بھی"

ویما اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ
"ہمارا دل انتہائی سکون کا سرچشمہ ہے جو اس
کو مقدس مقاموں اور تیرتھ میں ڈھونڈتا ہے
بیوقوف ہے۔"

انسان کو سمجھنا چاہیے کہ
"کس مقصد کے لیے دریاؤں کے سنگم یا مقدس
دریاؤں یا پہاڑوں کے طواف کی زحمت اٹھائی
جارہی ہے؛ ان کو نہیں معلوم کہ خدا خود
انسان ہی کے اندر رہتا ہے۔"

انسان کو بجائے تیرتھ جاترا کرنے کے اپنے دل کی

چھان بین کرنی چاہیئے تا کہ وہ خدا پرستی کی اصل کو محسوس کرے۔ دیمآ نے اس خیال کو بڑی خوبی کے ساتھ یوں پیش کیا ہے کہ

"گو ہم جنگل جنگل پھریں لیکن پاکیزگی نہ وہاں
ہے نہ آسمان میں، نہ زمین پر جہاں مقدس
دریاؤں کا سنگم ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو پاک
کر، تب تو اس بادشاہ کے درشن کر سکے گا۔"

تیرتھ جاترا کے خیال سے انسان بھٹک جاتا ہے اور اپنے سے غافل ہوکر زندگی کے مصنوعی کھیل میں پڑا رہتا ہے۔ ایسا انسان اصلی مذہبیت کے جذبے سے محروم بھی رہتا ہے۔ اس طرح انسان کی تہذیب میں خامی پیدا ہو جاتی ہے۔

نواں باب

زندگی کی بے حرمتی

(مورت پرستی)

اپنے سے بے خبر انسان اپنی زندگی کی نشوونما غیر انسانی چیزوں میں سمجھتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کی پوشیدہ قوتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں بلکہ ایسے انسان میں گھٹ کر مر جاتی ہیں۔ وہ اس بات سے کبھی آگاہ ہی نہیں ہوتا ہے کہ اس میں ایسی بلا کی قوتیں موجود ہیں جن کی تشکیل اگر کی جائے تو اس کو کامل انسان کی منزلت حاصل ہوسکتی ہے لیکن دنیا کے رہنے والے اس سے غافل ہیں اور نہ ان کو ایسا سبق دیا جاتا ہے اور نہ ان کا

مذہب انسان کامل کی تعلیم دیتا ہے ۔ انسان جو دنیا میں ہے سب کچھ دیکھتا ہے سوائے اس کے کہ وہ انسان کو انسان بنتا ہوا دیکھے ۔ انسان کا بننا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دنیا یہ نہیں سمجھتی کہ انسان کا بننا اس کا سب سے اہم فرض ہے ۔ معاشرے کے قوانین انسانوں کو انسان کی مختلف گروہ بندیوں میں جکڑ کر انسانی زندگی کی بے حرمتی کرتے ہیں اور باور کراتے ہیں کہ انسان تہذیب پا رہا ہے، لیکن اگر انسانی زندگی پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر معاشرہ انسان کی زندگی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے ۔ اس طرح انسان گمراہی کے پھندوں میں پھنسا ہوا ہے ۔

دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے انسان کی زندگی کی بے عزتی دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ انسان کو اخلاق سکھائیں، مذہب دیں، خدا سے آشنا کرائیں تا کہ سویا ہوا انسان جاگ سکے ۔ ایسی انسانی بیداری کی کوششیں ہر زمانے میں ہوئیں لیکن صرف وہی کوششیں کامیابی کا منہ دیکھ سکیں

جن کے ذریعے یہ پیام دیا گیا تھا کہ انسان جب تک خود اپنی ہستی کو نہیں پہچانتا اسوقت تک اس کی زندگی میں اخلاق کے اصول، مذہب کا احترام اور خدا کی پرستش ممکن نہیں ہے۔
اگر اخلاق، مذہب اور خدا، زندگی سے علیحدہ ہیں تو انسان کی زندگی پر ان کا اثر نہیں پڑتا۔ ان کا تعلق انسان سے ہے، نہ کہ انسان کا اُن سے۔ دنیا کے انسانوں کی زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہم پر یہ چیز عیاں ہوجاتی ہے کہ انسان اخلاق، مذہب اور خدا پر یقین رکھتا ہوا ان کو اپنی زندگی سے الگ سمجھتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ نہ اخلاق کا پابند، نہ مذہب کا پیرو اور نہ خدا کا ایسا معتقد ہوسکا جیسا کہ اس کو ہونا چاہیے۔ گو عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ وہ اخلاق، مذہب اور خدا کے قائل ہیں لیکن ان کا عمل اس بات کو ثابت کردیتا ہے کہ ان کی زندگی میں نہ کوئی اخلاقی اصول کام کرتا ہے، نہ کوئی مذہبی جذبہ اور نہ کوئی خدائی حکم۔ وہ دراصل دنیا کے بندے

ہیں جن کے منہ میں الٹ پھیر کے ساتھ یہ الفاظ
آتے رہتے ہیں ۔ ان کے قلب نے اخلاق، مذہب
اور خدا کے احکام ابھی تک نہیں سمجھے ۔ دنیا کی
پرستش کرتے ہیں، لیکن اخلاقی مذہبی اور خدائی
احکام سے بہت دور ہیں ۔ اس انسانی ذہنیت
کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں نے
انسان کی حقیقت اور انسان کی اہمیت کو اپنی
زندگی میں کوئی جگہ نہیں دی ۔ اخلاق، مذہب
اور خدا کا دباؤ انسان پر پڑا لیکن انسان کو یہ
نہ بتایا گیا کہ وہ اپنے میں ان چیزوں کو
کہاں کہاں پا سکتا ہے ۔ انسان کی اس تعلیم
کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اخلاق، مذہب اور خدا
کے الفاظ سے آشنا تو ضرور ہو گیا لیکن اس کی
زندگی ابھی تک کھوکھلی رہی ۔

دنیا کے پہنچے ہوئے لوگوں نے انسان کو
اس کی خامی سے ہمیشہ آگاہ کیا اور یہ بتایا
کہ اخلاق، مذہب اور خدا انسان کی عملی زندگی
میں ہیں ۔ اسی جستجو میں ویپا بھی گرفتار تھا۔
انسان کی پُر غفلت زندگی ویپا نے محسوس کی

اور اپنے خیالات کی اشاعت سے لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ وہ سب سے پہلے انسان ہیں، لیکن انسانیت سے بے خبر نہ رہیں۔ اخلاق اور مذہب محض تخیلات ہی نہیں بلکہ انسان کی قوتوں کے مختلف پہلو ہیں۔ ویما کے تخیل میں جس اصول کی بازگشت رہ رہ کر آرہی تھی وہ انسان کے تحفظ کا اصول تھا۔ وہ مذہب کے خلاف نہ تھا، نہ اخلاق کے اور نہ خدا کے۔ اس کی زندگی خود ان تینوں کے احکام کا ایک زندہ نمونہ تھی۔ مذہب پرست یا خدا پرست انسان انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، لیکن انسان کی زندگی کا وہ نظریہ اور اصول جو مذہب پرستی یا خدا پرستی کے راستے میں سدّباب ہو انسانیت کی تشکیل میں بھی حائل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ویمنا، خدا پرستی کے مخالف اصولِ زندگی کو انسانی زندگی کی بے حرمتی سمجھتا تھا۔

زندگی کے ساتھ "شرک" کا پیدا کرنا ویما کی نظروں میں ایک بہت ہی گرا ہوا خیال ہے، کیونکہ انسان کی اس سے تذلیل ہوتی ہے۔

ویماؔ کے نزدیک مورت پرستی ہی زندگی کا شرک ہے۔ وہ مورت پرستانہ ذہنیت اور زندگی سے اچھی طرح واقف تھا۔ خدا پرستی پر کامل یقین کرتے ہوئے وہ مورت پرستی کے ڈھکوسلے سے آگاہ ہوگیا تھا۔ مورت پرستانہ دنیا اس کے سامنے تھی اور اس کے کرتبوں اور طریقوں کے جنجال میں لوگ کس طرح پھنستے ہیں یہ بھی ویماؔ جانتا تھا۔ مورت سازی سے مورت پرستی تک جو منزلیں ہوتی ہیں ان کا مطالعہ اس نے کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ

"موم کے سانچے پر مٹی چڑھاکر اسس کو
پگھلاتے ہو تاکہ اس کی شکل نکھر سکے اور
اس کے خول میں پگلی ہوئی دھات بھی
ڈالتے ہو اور اس کو ایک مخصوص نشانی
سمجھ کر بیٹھاتے ہو۔ تم اسس کو دیوتا
کہتے ہو"

اسی طرح کے اس کے اور بھی مقولے ہیں مثلاً

"اُن بیوقوفوں کے متعلق ہمیں کیا خیال کرنا
چاہیے جو پہاڑوں سے پتھر لاتے ہیں اور

"ان کو اپنے ہاتھوں سے تراشنے کی زحمت اٹھا
کر شکل کرتے ہیں اور پھر اس کے سامنے سر
جھکاتے ہیں"

یا

"سنگ مرمر کا چونا جمع کرکے مندر بناتے ہو
اور پتھر کی پرستش میں خوش کیوں ہوتے ہو؟
پتھر کا احترام کرنے میں تم کو فائدہ کیا حاصل
ہوتا ہے؟"

مورت پرستی اور خدا پرستی کا مقابلہ کرتے ہوئے
ویما ان الفاظ میں اپنے خیالات ادا کرتا ہے:
"انسان پتھر کی مورت بناتا ہے اور اسے احترام
کے ساتھ بٹھا کر اس کی پرستش کرتا ہے۔
اس میں اس کی عقل کی کمی ہے۔ خدا کے
سمجھنے سے وہ انسان قاصر ہے جو یہ سمجھے کہ
خدا اس مورت کے اندر ہے۔"

یا

اے لوگو! پتھر کی مورت بنا کر ایک اندھیرے
کمرے میں نہ رکھو اور نہ اس کی پرستش
کرو۔ اے جاہل لوگو! کیا تم یہ نہیں جانتے کہ

خدا دل ہی میں رہتا ہے؟"

یا

پہاڑوں میں سے پتھر لا لا کر جمع کرتے ہیں اور خوبصورت مندر بناتے ہیں تا کہ ان کے اطراف پھر سکیں ۔ یہ تکلیف کیوں اٹھاتے ہو جبکہ خدا ایک زندہ ہستی ہے اور تمھارے اندر موجود ہے"

یا

پرستش میں جُھکنا اور زمین دوز ہونا کس لیے؟ کیا اس طرح مندر کے سخت پتھر کی فطرت بدل جائے گی؟ انسان کا جسم خود ایک حقیقی مندر ہے ۔ اس میں ہماری روح کی موجودگی خدا کی موجودگی کو ظاہر کرتی ہے ۔ پتھروں کی پرستش جو تم کرتے ہو بے معنی ہے"

یا

اے بے حس لوگو! پتھروں کے سامنے جھکتے ہوئے تم یہ خیال کرتے ہو کہ خدا صرف انہی میں ہے ۔ زندہ ہستیوں میں یقین کیا جا سکتا ہے، لیکن پتھر میں کیا دھرا ہے؟ اس خیال کو ترک کر دو"

یا

وہی ہستی احترام کے قابل ہے ، جو ہمارے
زندہ جسموں میں رہتی ہے۔ پتھروں کے بنے ہوئے
مندروں میں قربانیوں کے انبار کیوں جمع کرتے
ہو۔ پتھر کے دیوتا ان انباروں کو کس طرح
کھا سکتے ہیں؟

یا

"اگر کسی سنگ مرمر کے بیل کو تم دیکھتے ہو
تو بڑے تکلف کے ساتھ اس کے سامنے جھک
جاتے ہو ، لیکن جب تم ادھ مرا بیل دیکھتے
اور اس کو مارتے بھی ہو تو تمھاری طبیعت
میں کیوں رحم نہیں آتا؟ بیل کے پوجنے والے
درحقیقت بدبخت گناہ گار ہیں۔"

یا

ان لوگوں کے لیے یہ کہاں تک واجب ہے
کہ پتھروں کی مورتیوں کو پوجیں جب کہ وہ
اصول فطرت کا احترام بھی کرتے ہیں۔"

ویما نے مورت پرستی میں انسان کی بھلائی نہیں
دیکھی بلکہ اس کا یقین تھا کہ

" جو پتھر کے سامنے جھکتا ہے وہ مثل ایک
بے جان مورت کے پیدا ہوگا۔"

مورت پرستانہ زندگی انسان اور اس کی انسانیت
کو دفن کردیتی ہے۔

دسواں باب

زندگی کی خواہشیں

(بدی اور نیکی)

مذہب پرست، ماہر تعلیم اور معلّم اخلاق کی دانست میں انسانی خواہشوں کی تہذیب مقدم ہے ورنہ انسان اور جانور میں فرق نظر نہ آئے گا۔ جبلتیں جانوری زندگی میں عریاں خواہشوں کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ گو انسان کی زندگی میں بھی جانوریت کی بو آتی ہے، لیکن انسان کا معاشرہ خواہشوں کو انسانیت کا جامہ پہنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ ہر زمانے کے معاشرہ نے مذہب، اخلاق یا تعلیم کے ذریعے انسان کی تربیت کی تاکہ

اس میں جانوریت کی بجائے سماجیت اور 'انسانی'
جبلتیں پیدا ہوں ۔ انسان کی ترقی در اصل اس
میں دیکھی گئی کہ وہ اپنی خواہشوں پر کہاں تک
حاوی ہے ۔ مذہب نے خدا کی پرستش میں انسان
کی تہذیب کا راستہ ڈھونڈ نکالا ۔ اخلاق نے انسان
کو یہ پیام سنایا کہ وہ ایک جانور یا وحشی نہیں
بلکہ انسان ہے جو اپنی خواہشوں پر قابو پانے
کے بعد دنیا میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ رہتا
ہوا نیکی کما سکتا ہے ۔ تعلیم نے انسان کو اس
امر سے آگاہ کیا کہ جب تک وہ اپنے کو نہیں
سمجھتا اس وقت تک وہ اپنے پر آقائی حاصل
نہیں کرسکتا۔ اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے علم درکار ہے۔
علم ہی وہ قوت ہے جو انسان کو انسان بناتی اور
اس سے مستفید ہونے کے بعد انسان اور دنیا
میں رشتۂ انسانیت جڑتا ہے ۔ اسی وجہ سے
مذہب پرست ، ماہر تعلیم اور معلّم اخلاق نے
اپنے اپنے طریقے سے انسانوں کو انسان بنانے
میں مدد دی تاکہ ان کی جبلتیں تہذیب پا سکیں
انسان کو حقیقت میں انھیں نے جانور بنے رہنے

سے روکا اور انسانی مرتبے پر پہنچایا۔ مہذب انسان خواہشوں کا مارا ہوا انسان نہیں ہوتا بلکہ اس کی زندگی میں خواہشیں تربیت کے سانچے میں ڈھلکر انسانی روپ میں آتی ہیں۔

ویما نے انسانی تہذیب کی تشکیل میں خواہشوں کی جبلی کیفیت کو کوئی جگہ نہیں دی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ انسان کی جانوری جبلتیں انسانی خواہشوں میں تبدیل ہوکر انسان کے درجے کو اونچا کریں۔ انسان کی بدی اور نیکی میں خواہشوں کی وجہ سے جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ درحقیقت فطری اور سماجیتی جبلتوں کا ہے۔ ویما نے زندگی کی خواہشوں کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا تھا۔ انسان کی بدی میں وہ خلاف سماجی اور انسانی قوتیں کام کرتی ہیں جن کے ذریعے سے انسان کی جبلتوں کی سماجیت میں رخنہ پڑتا ہے۔ ویما کہتا ہے کہ

"جس طرح مچھلی پانی کے اندر شکار کی چاہ میں کانٹے میں پھنس کر مر جاتی ہے اسی طرح انسان خواہشوں کے پھندے میں پھنس کر

برباد ہو جاتا ہے۔"

" انسان اپنے سے بے خبر ہوکر اپنی خواہشوں
کی نگہداشت نہیں کرتا"
جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ
" لوگ اپنی زندگی کے تمام دن گردش میں
کاٹ دیتے ہیں اور دنیا کے فریب کو نہیں
پہچانتے ۔ ایسے انسان خواہشوں کے مارے ہوئے
ہوتے ہیں ۔ ان کی حالت مکھیوں کی سی ہے
جو شراب کے برتن پر بیٹھی رہتی ہیں۔"

بُری جبلتیں بدی کی شکل میں انسان پر قابو
پاتی ہیں اور اس کو انسانی نقطۂ نظر سے بے کار
کر دیتی ہیں ۔ ان کی بیخ کنی ممکن ہے۔وہ اسطرح کہ انسان
کی طبیعت میں نیک خیال اور عمل پیدا ہو ۔
جبلتوں کی بد خصلت بذات خود فنا نہیں
ہوسکتی لیکن ان کا ارتفاع ہوتا ہے ۔ انسان
کا خیال اور اس کا عمل جبلتوں کی سماجیئت
کرسکتا ہے ۔ انسان میں وحشیت کو دبانے کے
لیے ویما یہ سمجھتا تھا کہ انسان کو بد اور نیک
خصائل کی اہمیت سے واقف ہونا لازمی ہے

اسی وجہ سے وہ کہتا ہے کہ

"وہ انسان ایک وحشی ہے جو نہ خود کھاسکتا ہو اور نہ دوستوں کو اپنے قریب آنے دیتا ہو"

یا

"کسی عالم کی گفتگو سے مسرت کا حاصل کرنا آسان ہے، لیکن کسی کے ساتھ ہمدردانہ مالی مدد کرنی مشکل ہے۔ انسان دوسرے کو بآسانی سخاوت کی ہدایت دیتا ہے لیکن خود سخی نہیں بنتا"

ویما کے اس خیال سے انسان کے دو پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ کنجوس اور سخی انسان کے دو نمونے ہیں جن میں فطری اور سماجیتی جبلتیں انسان کی بربادی یا تشکیل کے درپے رہتی ہیں۔ کنجوس اور سخی انسانوں کی نفسیاتی تصویر ہیں۔ ویما نے کنجوس اور سخی کو دولت کی کسوٹی پر نہیں کسا بلکہ انسانیت کے ترازو میں تولا ہے۔ ویما کو کنجوسی میں انسان مرجھاتا ہوا اور سخاوت میں انسان پھلتا پھولتا ہوا دکھائی دیا ہے۔

لہٰذا ویما کا یہ کہنا کہ سخاوت زندگی کی نشو و نما کا نام ہے اور کنجوسی موت کا، غلط نہیں ہے۔

اسی طرح ویما نے انسانوں کے اس عیب کو آشکارہ کیا جس کو دنیا میں تہمت لگانا کہتے ہیں کیونکہ اس سے انسان کی گری ہوئی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"دنیا میں ہر زخم کے لیے دوا مل سکتی ہے
لیکن تہمت سے جو زخم انسان کے سینے
میں لگتا ہے اس کی کوئی دوا نہیں"

بے رحمی بھی ویما کی نگاہوں میں بری خواہشوں کا نتیجہ ہے۔ دل کے درد اور سوز کی پکار بے رحمی کی تلوار سے گھائل ہوکر چپ ہوجاتی ہے۔ زندہ انسان بے رحمی کے جذبے کی وجہ سے مُردہ ہوجاتا ہے۔ ویما نے ایسا ہی محسوس کیا۔ وہ اپنے محسوسات کو یوں واضح کرتا ہے کہ

"جانوروں کو ذبح کرنا خدا کے خلاف گناہ ہے۔
دیکھ اور سمجھ کہ تمام جانور اس کے روپ
ہیں۔ ہر بے گناہ زندہ مخلوق خدائی کا روپ
ہے"

یا

"وہ بے رحم کتنے بد ہیں جو بیل کو آختہ
کرنے کی جرأت کرتے ہیں"۔

ویما نے انسان کی زندگی میں لالچ سے جو
اثرات نمودار ہوتے ہیں دیکھے تھے اور اس کو
بے حد افسوس بھی ہوا تھا۔ لالچ انسانی کردار
کا بدترین پہلو ہے۔ اسی وجہ سے ویما کا ارشاد
ہے کہ

"لالچ بدترین گناہ ہے"۔

بے رحمی اور لالچ انسان کی جبلتوں کی بربریت
کو بے لگام کردیتی ہے اور اس کو گمراہی کا راستہ
دکھاتی ہے۔ ویما نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ
لوگوں کی ذہنیت بد ہوگئی ہے کہ وہ اپنی بے خبری
کے عالم کو بھول کر دوسروں کے پیچھے پڑے
رہتے ہیں۔ اسی میں وہ اپنی خوشی سمجھتے ہیں۔ دوسروں
کی برائیوں پر آنکھ لگائے رہتے ہیں اور موقع
بے موقع برائیوں کا اُچھالنا اور پھیلانا ان کا
شیوہ سا ہوگیا ہے، لیکن اگر کوئی انسان ان
کی برائیوں کو گنواتے لگے تو تاب نہیں لاتے۔

ویما کہتا ہے کہ

"ایسے لوگ بے شمار ہیں جو دوسروں پر
نکتہ چینی کرتے اور برائیاں ڈھونڈتے رہتے
ہیں، لیکن یاد رہے کہ دنیا میں ہر ایک انسان
کے اندر برائیاں موجود ہیں۔ جو لوگ دوسروں
میں برائیاں دیکھتے ہیں وہ اکثر وبیشتر اس بات
کو بھول جاتے ہیں کہ ان میں بھی برائیاں
ہیں۔"

ویما ایسے لوگوں کو دیکھ کر بے حد رنجیدہ ہوتا
تھا جو بے خیالی کی بنا پر اپنے میں بد خیالی
پیدا کرکے اپنی طبیعت کو ہمیشہ کے لیے بدخصلت
بنا لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ویما کہتا ہے کہ

"بد لوگوں کو سکونِ قلب حاصل نہیں ہوسکتا
خواہ وہ کتنی ہی دعائیں مانگیں اور مذہبی
رسمیں ادا کریں۔ انھوں نے اپنی طبیعت
سے مکرو فریب کو دور نہیں کیا ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ ان کی حالت پر تاریکی چھائی
رہتی ہے۔"

ویما اسی خیال کو ایک دوسرے پیرائے میں اس طرح

پیش کرتا ہے کہ

"انسان کے لیے اپنی خصلت کا بدلنا تو ممکن
اس لیے نہیں کہ وہ اپنے سے غافل ہے
لیکن وہ دوسروں کو اپنے ذہن میں تولتا
ہے اور اپنے ہمسایہ پر بھی افسوس کرتا ہے۔
اے ویماؔ! وہ شخص درحقیقت گرا ہوا انسان
ہے۔"

انسان کا زوال ویماؔ کی نظروں میں دوسروں کی برائیوں کے ڈھونڈنے میں ہے۔ انسان کی زندگی میں خلاف سماجی جذبے کو اسی ذہنیت سے اشتعال ہوتا ہے اور اس کی جبلت کا زور رونما ہوتا ہے۔ ویماؔ کے خیال میں انسان کا ایسا فعل لغو تخیلات کا نتیجہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"لغو خیال آرائیوں میں پڑ کر اچھے لوگ
بھی بگڑ جاتے ہیں۔"

انسان کی بد خیالی جھوٹے قول کا پیش خیمہ ہے۔ نیک انسانوں کے قول میں اس وجہ سے صداقت پائی جاتی ہے کہ وہ سچ بولتے اور

جھوٹ سے پرہیز کرتے ہیں، لیکن بدخصلت یا بدگو انسان بد خیالی کی بنا پر جھوٹ بولتا ہے۔ ویما ان کے متعلق یوں کہتا ہے کہ

"اگر تیرا قول جھوٹا اور فریب سے بھرا ہے
تو تجھ کو سکونِ قلب کس طرح حاصل
ہوسکتا ہے؟ تیری بات چیت سے نخوت
ٹپکتی ہے۔ آخر یہ کیوں؟ اس میں کوئی
خوبی نہیں بلکہ تیرا یہ خیال لغو ہے"

اسی خیال کی ترجمانی اس نے ایسے بھی کی کہ

"جن لوگوں کے قول جھوٹے ہوں اور دلوں
میں فریب بھرا ہو ان کی روح کا وجود
آخر کس لیے ہے اور زندگی سے کیا حاصل؟
اگر تیرے قول میں سچائی ہے تو تیری
زندگی میں سو سال کا اضافہ ہوسکے گا"

انسان کی گری ہوئی حالت کی وجہ اس کی خواہشوں کی بے لگامی ہے۔ ویما کا یقین تھا کہ

"جو انسان اپنی خواہشوں کا شکار ہوچکا ہو
وہ سب سے نیچ ہے۔ برتر انسان وہ ہے

جس نے اپنی خواہشوں پر قابو پا لیا ہو۔"
انسان کی روحانی زندگی کی تشکیل میں خواہشوں کی تہذیب بے حد ضروری ہے۔ اسی وجہ سے ویما کہتا ہے کہ

"جب تک کہ تو خواہشوں کی رسی کو کاٹ
کر پھینک نہ دے تجھ کو بہشت نہیں ملیگی۔"

انسانوں کی فطرت سے وہ خوب واقف تھا۔ سب سے قوی تر خواہش جو انسانوں کو ستاتی اور دق کرتی ہے وہ شہوت ہے۔ ویما نے کیا خوب کہا ہے کہ

"شہوت انسان کو کتّے کی طرح بے چین
رکھتی ہے۔"

اسی خیال کو اس نے دوسرے انداز میں یوں پیش کیا کہ

"تمھاری شہوتوں سے بڑھ کر کوئی اذیت
نہیں ہے۔ جب تک کہ تم اس مسئلے پر
غور نہ کروگے تمھیں سکون حاصل نہیں
ہوسکے گا اور جب تک تمھارے دل کو سکون
نصیب نہیں ہے اس وقت تک تمھارے لیے

کوئی نجات بھی نہیں ۔
شہوت جانوریت ہے ۔ اسی وجہ سے دیما لوگوں کی شہوانی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ اپنی جانوریت کی فطری زندگی کے اظہارات پر سوچیں اور اپنے کو انسان بنائیں ۔ اس طرح انسان کی وحشیانہ جبلت تہذیب پاسکتی ہے۔
کہتے ہیں کہ انسان کی بدی گناہ کراتی ہے۔ دنیا میں لوگ گناہ کرتے ہیں، لیکن گناہ کو بے حد برا مانتے ہیں ۔ مذہب بھی اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ انسان کو گناہ کرنے سے ڈرنا چاہیئے ۔ گناہ دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ کیا اس کا تعلق دنیوی انسان سے فطری ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا بسر ہونا ممکن نہیں؟ یا انسان نے ابھی تک یہ نہیں جانا کہ گناہ کس کو کہتے ہیں؟ عام طور پر گناہ اس انسانی فعل کو سمجھا جاتا ہے جو "احکام" کے خلاف ہوں، بالخصوص مذہبی یا اخلاقی ۔ احکام انسان کی زندگی کے باہر تصور کیے جاتے ہیں۔ انسان کی دشواری یہی ہے کہ وہ احکام میں اور

اپنے میں ربط اور ہم آہنگی کے رشتہ کو قایم کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ۔ اسی وجہ سے گناہ "احکام" کی خیال پرستی میں ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ انسان کو یہ نہیں بتایا گیا کہ گناہ "احکام" کی خلاف ورزی نہیں بلکہ اپنی خود زندگی کی خلاف ورزی ہے ۔ اس لحاظ سے گناہ انسان کے اعمال سے سرزد ہوتا ہے۔

دیپا نے گناہ کو اسی معنی میں سمجھایا تھا. وہ کہتا ہے کہ

"گناہ کس کو کہتے ہیں ؟ کیا اس کا کوئی مخصوص مقام ہے ؟ گناہ درحقیقت ہمارے اعمال میں پوشیدہ رہتا ہے ۔ لہذا یہ بہتر ہے کہ ہم اپنے آپ سے چوکنے رہیں نہ کہ ایک محنتی آدمی کی طرح پسندیدہ کام کو انجام دیتے رہیں"۔

فرائض کی ادائی سے گناہ دھلتا نہیں بلکہ عمل زندگی کی راست بازی گناہ کو غارت کردیتی ہے ۔ انسان کی زندگی میں گناہ کے تخیل کو دیپا اس طرح واضح کرتا ہے کہ

"فریب سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہے۔
یہ کراہت منہ میں ہمیشہ رہتی ہے۔"

ویماؔ کے اس خیال سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کی وہ جبلتیں جو برائی پیدا کرتی ہیں انسان کو گناہ گار بناتی ہیں۔

گناہ کا توڑ ویماؔ کی نظروں میں جذبۂ احساں ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھاتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ

"تیرا احسان تیرے گناہوں کی پردہ پوشی
کرے گا۔ وہی تیرا ساتھی ہے۔ اس دنیا
میں تیری نجات کا وہی ایک ذریعہ ہوگا
اور وہی تیرا آسرا بھی ہے۔"

واللہ یحب المحسنین۔

ویماؔ انسان کی صلاحیت کو باور کراتے ہوئے اعمال کی درستی میں گناہوں کا خاتمہ دیکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ خواہشوں کا تعلق گناہ سے نہیں ہے۔ اس خیال کی توضیح یوں کرتا ہے کہ

"ہماری تمام خواہشیں دل میں پیدا ہوتی ہیں
لیکن گناہوں کے چھٹکارے کا سوال ان

خواہشوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔"

ویماؔ کا یہ کہنا اس امر کو صاف کردیتا ہے کہ انسان کا گناہ اس کے اعمال میں مخفی ہے۔ عمرانی دنیا میں انسان کی محویاتی اور کیفیاتی مجبوری اور پابندی ویماؔ پر عیاں تھی۔ ان کے کڑے پھندوں میں انسان پھنسا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ویماؔ کہتا ہے کہ

"گناہ گار لوگ وقت اور زمانے کے تابع ہیں۔"

وقت اور زمانے کے رجحانات اور تخیلات انسان کو گناہ گار بناتے ہیں۔ یعنی اس کے اعمال کی بربادی وقت اور زمانے کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ اگر گناہ گار انسان بہتر بننا چاہتا ہے تو اس کو وقت اور زمانے کے خلاف کھڑا ہونا ہی ہوگا اور لڑکر اپنی تہذیب کرنی پڑے گی۔ گناہ گار کی ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ

"گناہ گار مصیبت کے وقت خدا کو برا بھلا کہتا ہے۔ اگر اس کی زندگی اچھی کٹ رہی

ہو تو وہ خود کی تعریف کرتا ہے لیکن
اچھائی اور برائی حقیقت میں اس کے اعمال
کے نتیجے ہیں۔"

یا

جو اس کا جی چاہے پڑھنے دو یا مقدس
کتابوں کو سننے دو! لیکن گناہ گار اپنی طبع بد
کو چھوڑتا نہیں ہے۔"

گناہ گاری وحشت پرستی کا نام ہے۔ ویما یوں
کہتا ہے کہ

"پیدائش کے بعد جیسے جیسے زندگی بڑھتی
جائے ویسے ہی انسان کو چاہیئے کہ اپنے
گناہوں سے با خبر ہوتا رہے اور اپنے میں
وحشی کو پنپنے نہ دے بلکہ راست بازانہ طریقِ
زندگی کے ذریعے سے سکونِ قلب حاصل کرنے
کی کوشش کرے۔"

انسان کا بننا بد اعمال کے زائل اور نیک
اعمال کے پیدا ہونے میں ہے۔

نیک لوگ اہلِ دل ہوتے ہیں۔ ویما کی
دور بین نظروں نے اہلِ دل کو دنیا میں کم دیکھا

اور اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے اہلِ دل کی تعریف میں گن گائے۔ ایسے لوگوں میں اوصافِ حمیدہ موجود ہوتے ہیں اور انسانی شعار کا نمونہ ان کی زندگی ہوتی ہے۔ وہیما یہ دیکھ کر متحیر ہوتا ہے کہ دنیا میں اہلِ دل کی تعداد کتنی کم ہے۔ اس نے اپنی اس حیرت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"ایسا انسان کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتا
جو اپنے دل کو پہچان چکا ہو۔ انسان مشکل
سے ملتا ہے جو اپنے دل سے آگاہ ہو"

دل کو قابو میں لانے سے کامل انسان اپنی انسانیت کی منزلیں طے کرتا ہوا نجات حاصل کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ویما کا ارشاد ہے کہ

"جو اپنے دل کو قابو میں لانے کی کوشش
کرتا ہے اس کو سکون حاصل ہوجاتا ہے اور
اسی کو نجات بھی مل سکے گی"

کیونکہ ویما کا یقین تھا کہ

"دل کی قوتوں میں سکون جنم لیتا ہے۔ وہ
لوگ جو اپنے دل کو نہیں پہچانتے اور خیالات

پر قابو نہیں پاتے اپنے آپ کو موت کے
حوالے کر دیتے ہیں۔"

یہاں ویما اس انسان کی زندگی پر افسوس کرتا ہے جس کو سکون نصیب نہیں ہوا۔ وہ ہستی محض مرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے، نہ کہ نجات کے حاصل کرنے کے لیے۔

سکونِ قلب انسان کی زندگی کی وہ کیفیت نہیں جس پر جمود کا عالم طاری ہے بلکہ نشو و نما پانے کے بعد زندگی کی تعمیری قوتوں کا توازن اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ نباتاتی زندگی کا نام سکون قلب نہیں ہے۔ اہلِ دل حرکی زندگی کے حامل ہیں۔ زندگی پر فتح یابی پانا اہلِ دل کا مسلک ہے۔ اسی وجہ سے ویما کہتا ہے کہ

"جو یہ نہ جان سکے کہ انتہائی کمال کا سرچشمہ دل ہے شہوت کے جال میں پھنس کر مرجاتا ہے۔ اصل میں سچا بزرگ وہی ہے جو پاک خیالی میں تبدیل ہو چکا ہو۔ اسی کو دنیا کے اصلی راز سے آگاہی ہو چکی ہے۔"

لوگوں کی بے خیالیاں اور خیال آرائیاں قلبی قوتوں کو زائل کردیتی ہیں۔ قلبی قوت اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک انسان قلب کی اہمیت کو اپنی نشوو نما کے لیے ضروری نہ سمجھے۔ قلب کی قوت سے بے خبری گمراہی ہے۔ ویما کہتا ہے کہ

"کیا کتا گوشہ نشینی اختیار کرسکتا ہے؟
کلنگ کے مراقبوں میں کیا کوئی اصلیت
ہوسکتی ہے؟ گدھے کے بھجن گانے میں کیا
یقین آسکتا ہے؟ مینڈک کا اشنان کب
ممکن ہے؟ افسوس! اپنے دل کے جاننے
کی کوشش تم کیوں نہیں کرتے؟"

سکونِ قلب نفس کشی میں نہیں بلکہ نفس کی تہذیب یا دل کی صفائی میں ہے۔ ویما اسی خیال کو یوں پیش کرتا ہے کہ

"نفس کشی کی آگ میں اپنے آپ کو
جلا کر بزرگی حاصل نہیں ہوتی بلکہ انھوں
نے ابھی تک اپنے دلوں کی کدورت کا
سراغ نہیں لگایا۔"

نفس پرستی اور نفس کشی کے خیال کو دمیتا
نے ان الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے ادا
کیا ہے کہ

"کھانے کی زیادتی موت سے قریب تر
کردیتی ہے اور حد سے زیادہ پرہیز زندگی
کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ لہذا زندگی
اور موت کی ابتداء غذا ہے"

اعتدال پسندی سکونِ قلب کی قوتوں کو فروغ
دیتی ہے۔ قلب کی تہذیب میں کامل انسان
پروان چڑھتا ہے۔

دیما کا یقین تھا کہ انسان جب تک بد
اور نیک اعمال پر غور نہیں کرتا اس وقت
تک اس کی نگاہوں سے اصلی انسان جو
اس میں موجود ہے چھپا رہتا ہے اسی وجہ
سے دیما نے اپنے خیال کو یوں پیش کیا کہ

"جان لے کہ گناہ سر کو جھکاتا ہے۔ نیکی
روحانیت میں جنم لیتی ہے، لیکن اس
بات کے سمجھنے میں بڑے استقلال کی ضرورت
ہے"

گناہ گارانہ زندگی کی طرز اور روش ویما
کی آنکھوں کے سامنے گھومتی پھرتی ہے۔ انسان
زندگی میں گناہوں پر گناہ کرتے ہیں، لیکن
اُن کے اس یقین کو کہ خدا کے نام لے لینے
سے اس کو نجات مل سکے گی ویما ایک
خیالِ خام سمجھتا تھا اور ان کی غفلت پر اس
کو افسوس ہوتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ

"موت کے وقت خدا کا نام لینا کیا بے سود
نہیں؟ کیا تیرا جنم اسی طرح تبدیل ہوا تھا؟
یاد رکھ کہ تیرے گناہوں میں کوئی فرق
نہیں آیا اور نہ تو بہتر ہوسکے گا۔"

گناہ گار اپنی اصلی زندگی سے بے خبر ہے۔
لہٰذا اس کے عقیدے میں سچائی کیسے ممکن ہے
جب کہ وہ بد اعمال کا مجسمہ ہے۔ ویما نے
اس کو راستہ دکھایا اور کہا کہ

"اچھے لوگوں کی محبت نہ چھوڑو۔ ہم میں
یقین پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم
اپنی گری ہوئی حقیقت کو نہ سمجھیں۔ گناہ گار
کے عقیدے میں استواری کیسے آسکتی ہے؟"

گناہ گاروں سے مخاطب ہوکر ویما کہتا ہے کہ

"گناہ کرنے سے ڈرو اور موت سے ہیبت
کھاؤ۔ دنیوی محبتوں کے بندھن کو بھول
جاؤ، لیکن کسی کی بھی مہربانی کو جو تمھارے
حال پر ہوئی ہو کبھی نہ بھولو۔"

یا

"ہر قسم کا جھگڑا اور دوسروں کا عیب انسان
کو بھول جانا چاہیے لیکن اس بھلائی کو کبھی
نہیں بھولنا چاہیے جو ہمارے ساتھ کسی
دوسرے نے کی ہو۔"

اس اصولِ زندگی پر چل کر ایک گناہ گار
نیک انسان بن سکتا ہے

نیکی انسانی برتری ہے۔ ویما اس انسان
کو برتر نہیں سمجھتا جو برتر پیدا ہوا ہو۔ وہ
کہتا ہے کہ

"برتری کا انحصار پیدایش پر نہیں بلکہ نیکی
پر ہے۔ زندگی کا تمام اثاثہ انسان کی
نیکیاں ہیں۔"

ویما کا ارشاد ہے کہ

"یہ جسم کس کا ہے جس کی دیکھ بھال ہم
برابر کرتے رہتے ہیں؟ وہ روح کس کی
ہے ہم جس کی نگہداشت کے درپے ہیں؟
ہماری دولت کس کی ہے؟ یہ یاد رہے کہ
(نیکیاں صرف ہماری ہیں"
نیک اعمال کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ویما
کہتا ہے کہ
"اگر کوئی کام نیک نیتی سے کیا جائے تو
خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو حقیر تصور کیا
نہیں جاسکتا"
نیک انسان اور گناہ گار انسان کے اطوار
میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ گناہ گار اپنی زندگی
کو آشکارہ کرتا ہے لیکن سنجیدہ انسانوں کی نیکیاں
چھپی رہتی ہیں کیونکہ نیکی انسان کی طبیعت
میں سنجیدگی پیدا کرتی ہے اور وہ اپنی کمتری
کو ہمیشہ محسوس کرتا ہوا اپنی نیکیوں میں اضافہ
کرتا ہے ۔ اس کے بالکل برعکس گناہ گار اپنے
چھچھورے تخیلات کے اچھالنے میں کوشاں رہتا
اور برائی پر برائی اکٹھا کرتا ہے ۔ نیک انسان

وہی نہیں جو اپنی زندگی میں نیکی کماتا ہے بلکہ اس کا رویہ انسانوں کے ساتھ نیک تخیل اور عمل پر مبنی رہتا ہے۔ انسان کی عزت صرف ایک نیک انسان ہی کرسکتا ہے۔ اسی وجہ سے ویما کہتا ہے کہ

"خواہ تو اپنے بڑوں یا اپنے دوستوں سے
مخاطب ہو ان کی عزت کرنا تجھ پر واجب
ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو مصیبت میں پڑجائیگا
اور اس طرح تیری شرافت پر نام آئے گا۔"

ویما انسان کی بے حرمتی انسان کے ہاتھوں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے انسان کو یہ پیام دیا کہ انسان کی عزت کا سوال انسانی تہذیب کا سوال ہے۔ اسی میں انسان کی تہذیب کے اعلیٰ درجے کا اندازہ لگتا ہے۔ نیک اعمال انسانی عزت کی بناء پر نشوونما پاتے ہیں۔

گیارھواں باب

کتابی مذہب اور استاد

ویما کا کامل انسان عالمگیر مذہب کا حامل تھا۔ اس نے انسان کی تہذیب میں مذہب کو بڑی اہمیت دی تھی۔ اس کا یقین تھا کہ انسان درجہ کمال کو پہنچ نہیں سکتا اگر اس میں مذہبی تہذیب کا فقدان ہو کیونکہ انسانیت مذہبیت کے بغیر نشو و نما نہیں پاتی۔ مذہبیت اور انسانیت اس کی نظروں میں مماثل ہیں۔ فرقہ واری مذہبی طرزِ تخیل اور زندگی کا نام مذہب نہیں ہے۔ مذہب وہ عالمگیر قوت ہے جو انسانوں کی ہم جنسیت اور یکتائی بلا لحاظِ ذات، قبیلہ، فرقہ، نسل اور ملک پر موثر ہے اور ان کو انسانی رشتہ میں

جوڑتی ہے ۔ انسان کی تہذیب مذہب ہے اور
مذہب کا اہم ترین اصول، خدا پرستی، انسانوں کو
انسان بناتا ہے ۔

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں ۔ اگر انسان
ان کا صحیح مطالعہ کرے تو وہ اس نتیجے پر
پہنچے گا کہ ہر ایک مذہب کا بنیادی اصول ایک
عالمگیر تخیل کے تحت کام کرتا ہے ۔ خدا کی
ذات اور اس کی پرستش کا تعلق ایک مرکزی
حیثیت رکھتا ہے ۔ ان مذاہب میں جو فرق
عام طور پر دکھتا ہے وہ بنیادی اور اساسی نہیں
بلکہ ظاہری ہے ۔ عام لوگوں نے مذاہب کے
مفہوم کو ان کے ظاہری روپ میں سمجھا لیکن
روحِ مذہب ہر مذہب میں ایک ہی ہے ۔
ظاہری مذہب کو مذہب پرستی کے نام سے
موسوم کیا جاتا ہے ۔ اسی مذہب پرستی کی ذہنیت
انسانوں کے درمیان نفرت اور نفاق کی خلیجیں
پیدا کردی ہیں، لیکن مذہبی دنیا کے پہنچے ہوئے
بزرگوں نے مذہب کے قالب کو اصلی مذہب
نہیں مانا ۔ ان کا مذہب ایک عالمگیر قوت ہے،

جو فرقہ واری مذہب پرستی نہیں تصور کی جاسکتی۔
اسی وجہ سے ان کا پیامِ مذہب عام تھا۔
انسان کا سوال دنیا کے مذہبی بزرگوں نے اس
طرح حل کیا تھا۔

ویمنا یہ محسوس کررہا تھا کہ مذہب کا نام
دنیا میں لیا جاتا ہے لیکن اس کو بہت کم لوگ
سمجھتے ہیں۔ مذہب سیکھنے کی کوشش عام طور پر
کی جاتی ہے لیکن مذہب سکھانے والوں کی زندگی
میں مذہبی تعلیم کا اثر دِکھتا نہیں تھا۔ مذہبی
پیشواؤں کی ذہنیت کے متعلق ویمنا کہتا ہے کہ

"بات کرنا آسان ہے مگر اس کا بار ذہن
پر پڑتا ہے۔ ہم دوسروں کو تعلیم دیتے ہیں
لیکن اپنے کو سمجھ نہیں سکتے۔ تلوار ہاتھ میں
لینی آسان ہے، لیکن بہادر بننا مشکل۔"

اسی طرح ویمنا کو اس شخص کے عقیدے میں بڑا
شک ہے جو معلّم مذہب ہے کیونکہ

"خدا کے پوشیدہ روپ کو ایک معلّم علم کے
ذریعے سمجھنے کی کوشش میں منہمک ہے، لیکن
وہ خدا کو سمجھ نہ سکا۔ اس راستہ سے اس

کو راحت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا مطالعہ
صرف موت کا سبق دیتا ہے۔"
زندگی کو موت کے بھینٹ چڑھانا صرف وہ سیکھ سکا
لیکن موت کے مسائل کو سمجھنے میں کامیاب نہ
ہوا۔ اسی خیال کی ترجمانی ویماؔ نے کی ہے کہ
"علم حاصل کرنے کے بعد انسان اس امر سے
لاعلم رہتے ہیں کہ ان کو ایک دن مرنا
اور دوبارہ پیدا ہونا ہے۔ افسوس اس کا ہے
کہ انسان اپنی آنے والی تباہی سے آگاہ
ہوئے بغیر مرجاتے ہیں۔"
عالم کی لاعلمی حق کی تلاش میں ویماؔ نے اس
طرح پیش کی ہے کہ
"بیوقوف یہ کہتا ہے کہ "میں جانتا ہوں کیونکہ
میں پڑھ اور سیکھ چکا ہوں" وہ صرف فرضی
حکم کی تائید کرتا ہے لیکن حق آشکارہ ہونے
پر بھی وہ دیکھ نہیں سکتا ہے۔"
عاقل حق کی جستجو میں ناکام رہتا ہے کیونکہ
اس کو اپنی سمجھ و فہم پر بے حد ناز ہے۔
اسی وجہ سے ویماؔ کا یہ خیال صحیح ہے کہ

"عاقل کہلانے کا مستحق وہ نہیں ہے جو سمجھ و
فہم رکھتا ہو بلکہ اپنے حقیقی جوہر سے
پہچانا جاتا ہے"
مذہبی کتابوں کا محض پڑھ لینا کافی نہیں
ہے کیونکہ اس طریقے سے زندگی کا بھید معلوم
نہیں ہوسکتا۔ ویاس کہتا ہے کہ
"دھرم شاستر کے تمام احکام پڑھتے ہیں
اور اپنے ہاتھوں سے ان کو نقل بھی کرتے
ہیں۔ صرف یہی کرنا وہ جانتے ہیں لیکن
موت کے متعلق ان کی معلومات کچھ بھی
نہیں ہیں۔ ایسی پڑھائی کس کام کی جو
یہ نہ بتا سکے کہ مرنا کیسے چاہیئے!۔
یا
کتابیں جن کو وید کہتے ہیں بیسوا کے مثل
ہیں جو انسانوں کو دھوکے میں ڈالتی ہیں۔
وہ کلیتاً مبہم ہیں"
مقدس کتابوں کے مطالعہ سے انسان کی نجات
کا سوال حل نہیں ہوتا جب تک کہ انسان
روحانی جستجو نہ کرے۔ ویاس کہتا ہے کہ

"مقدس کتابوں کے مطالعہ سے مشتاق کے شکوک دور نہیں ہوسکتے، اگر وہ ذاتی آزمایش سے گریز کرتا ہے"

یا

"جو اس اعلیٰ ترین علم کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور دقیق حکمتوں کو پڑھتا ہے. اس کو نجات حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ وہ اچھے اور دانشمند لوگوں کی سنگت کی خوبی سے ناواقف رہے گا لیکن نیکی سے غیر مانوس ہوکر اپنی زندگی مصیبت ہی میں بسر کرسکے گا"

یا

"گو اس نے سب کچھ پڑھ لیا جو پڑھنے سے متعلق ہو وہ ایک مباحث بن کر رہ گیا ہے۔ اس فریبی کو آخر خوشی حاصل نہ ہوسکے گی۔

یا

"فریبی رہنما کے تحت ہمارے تمام افعال کی تربیت موت کے مختلف راستے ہیں۔ یہ تمام زحمت پیٹ کے پالنے کی غرض سے کیوں اُٹھائی جاتی ہے؟"

ویمآ نے کتابی مذہب کے عقیدے کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے جس کے ذریعے انسان یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ مذہب پڑھ کر مذہب حاصل ہوتا ہے۔ ویمآ کا یقین تھا کہ مذہب کتاب نہیں بلکہ زندگی ہے۔ مذہب عبارتوں میں نہیں ہے، الفاظ کی بندش میں نہیں، کتابی صفحے میں نہیں، چھپے حروف میں نہیں، لفظوں کے طلسم میں نہیں۔ مذہب اگر ہے تو وہ انسان میں ہے۔ مذہب کا سرچشمہ انسان ہے، اس کی بنیاد انسان ہے، اس کی نشوونما انسان ہے اور اس کا زوال اگر ہے تو انسان ہے۔ مذہب کا سمجھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ انسان۔ وہ فنی حیثیت رکھتا ہے اور غیر فنی بھی۔ مذہب کے سچے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ

"بغیر استاد کے علم صحیح طور پر حاصل نہیں ہو سکتا"

لیکن

"دنیا کے لوگ اپنے اوپر اعتماد رکھتے ہیں اور استاد کی نہیں سنتے جو انھیں نیک راہ

پر چلنے کی ہدایت کرتا ہوئے
ویما لوگوں کی دنیادارانہ ذہنیت سے خوب واقف تھا۔ وہ کہتا ہے کہ

"استاد کو باسی کھانا دینا تک تو ان کے
لیے ایک عذاب ہے لیکن طوایف پر اپنی
تمام دولت لٹا دینے کے لیے تیار ہیں۔
افسوس! کیا عالم رقاصہ سے بھی گرا ہوا ہے؟"

استاد درحقیقت

"اس کو جان جو دنیا کا استاد اور لوگوں کا
رہنما ہے۔ اس طرح تو نجات حاصل کرسکتا
ہے۔ جو استاد کو دیکھنے سے انکار کرتا ہے
وہ دوزخ کی خندق میں گرتا ہے"

مذہب کا سیکھنا استاد بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ویما نے استاد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ

"استاد سب کی جڑ ہے اور شاگرد شاخیں
ہیں۔ دنیا میں اصلی استاد کو لوگ بہت کم
پہچانتے ہیں"

اسی خیال کو وحدانیت کے پیرائے میں ویما نے

یوں ادا کیا ہے کہ

"روح اعظم ہماری اتالیق ہے۔ سمجھ و فہم
رکھنے والی انسانی ہستی متعلم ہے۔ اصلی استاد
وہ ہے جو اتالیق اور متعلم کی صفتوں کو
ایک دوسرے پر منطبق کرتا ہے۔ استادوں
کا استاد وہ ہے، جس نے اپنی خواہشیں
ختم کردی ہوں، جس نے شہوت کی آگ
بجھادی ہو، جس نے غصے کو مغلوب کرلیا ہو،
جس نے اصلی بھید کا سراغ لگایا ہو۔"

مذہبی احکام کا زندہ نمونہ در اصل حقیقی استاد ہے جس نے اپنی زندگی میں مذہب پایا اور جان لیا۔ اسی وجہ سے مذہب پڑھنے میں نہیں بلکہ استاد کی زندگی میں زندہ ہوتا ہے اور انسانوں میں سچی مذہبیت پیدا کرجاتا ہے اور ان کو انسانیت کا عملی سبق بھی دیتا ہے۔ ویما کا یقین یہی تھا اور اس نے ایسا ہی کر دکھایا۔

بارھواں باب

خدا پرستی اور انسان

خدا پرستی انسان پر واجب ہے۔ انسان خدا پرست ہوئے بغیر انسان نہیں بن سکتا۔ خدا پرستی انسان کے دل میں جنم لیتی ہے، نہ کہ اس کے ذہن میں۔ اسی وجہ سے ویدا کا ارشاد ہے کہ

"گو ہم کتنے ہی پرستش کے طریقے اختیار کریں لیکن ایمان بغیر احترام کے بے کار ہے۔ وفادارانہ اظہارِ عقیدت پرستش کا ہی ایک سچا ذریعہ ہے۔"

ایمان کا گھر انسان کا دل ہے۔ خدا اسی میں رہتا ہے۔ ویدا کہتا ہے کہ

" ایک انسان گھوم پھر کر بے اطمینان واپس
آتا ہے ۔ اس طرح اس کے دل کی آرزو
پوری نہیں ہوتی ۔ اپنے دل کو جو سکون
دے چکا ہو وہ خدا سے قریب تر ہوسکا"

یا

" اگر وہ خدا کا متلاشی ہے تو اس کو وہ
بآسانی اپنے اندر پالے گا"

لہذا دل کی جستجو میں خدا پرستی کی جستجو دکھائی
دیتی ہے ۔ دل کی تہذیب خدا کے پہچاننے کا
راستہ ہے ۔ ویما کہتا ہے کہ

" ان آنکھوں سے خدا کو کیسے دیکھا جاسکتا
ہے ۔ جو آنکھیں دیکھ سکتی ہیں دوسری ہوتی ہیں
نظر بھی مختلف ہوتی ہے ۔ کیا ہم اس کو
دل کی آنکھ سے دیکھ نہیں سکتے ؟"

دل کی آنکھ خدائی کے جلوے کی شہادت دیتی
ہے ۔ ایمان دل کی آنکھ ہے ۔ ویما کہتا ہے کہ

" ایمان کے توسط سے خدا اور انسان کا
رشتہ جڑتا ہے ۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے!
اسی میں اصلیت ہے ۔ ہمارے عقیدے کا

یہی دعویٰ ہے۔ انسان سے یہ تصور ہوتا ہے
کہ وہ اس مخفی قوت کو نہیں جانتا۔"
ویما کا یقین تھا کہ انسان اور خدا میں
بہت ہی قریبی تعلق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ
"اگر انسان خدا سے محبت کرتا ہے، تو خدا
بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ اگر انسان
اپنے سے محبت نہیں کرتا تو خدا بھی اس سے
محبت نہیں کرتا۔"
اس خیال میں ویما یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسان
کی نجات خود انسان کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی
یہ کہ انسان کا خدا سے محبت کرنا اور خدا کا
انسان سے، اس میں انسان کی زندگی کی تہذیب
ہوتی ہے نہ کہ بربادی اور جو انسان اپنے سے
محبت نہیں کرتا وہ خدا سے محبت بھی نہیں کرتا
اور نہ خدا اس سے محبت کرتا ہے۔ ایسا انسان
اپنی زندگی کے پیام کی آواز کو نہیں سنتا اور
اس سے بے خبر بھی ہے۔ اپنی زندگی کی
الجھنوں میں پھنس کر وہ اپنے کو بھول گیا اور
خدا سے غافل بھی ہوگیا ہے۔ خدا میں محویت

انسانیت میں محویت ہے ۔ خدا پرستی انسان شناسی ہے ۔ انسانوں کو غیر خدائی احترام سے آگاہ کرتے اور انسان اور خدا کے مابین فطریت کا رشتہ جوڑتے ہوئے ویما صاف صاف الفاظ میں انسانوں کے مالک کا ذکر یوں کرتا ہے :

"کل بنی نوع انسان کا مالک صرف ایک ہی ہے جو دنیا پر حکومت کرتا ہے ۔ کیا دوسرے دیوتاؤں کا احترام واجب ہے ؟"

خدا ایک ہے ۔ یہی ویما کا ایمان تھا ۔ خدا کے تخیل کے متعلق وہ کہتا ہے کہ

"جلیل القدر کا یہ تخیل کہ وہ زمین یا دھات لکڑی یا پتھر، نقشی دیواروں یا مورتیوں میں ہے غلط ہے"

بلکہ

"اس کا روپ عالمگیر ہے ۔ وہ غیر فانی ہے ۔ ان تمام کیفیتوں سے واقف ہے جو ہر دل میں گزر رہی ہیں ۔ وہ کل کائنات میں غیر متغیر اور تاریکی کے سایے سے آزاد ہے ۔ اسی ہستی کا نام وہی ہے جس کو خدا کہتے ہیں ۔"

مختلف مذاہب دراصل خدا کے مختلف راستے ہیں۔
ویما اس خیال کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ

"گائیں مختلف رنگ کی ہوتی ہیں، لیکن سب
کا دودھ ایک سا ہوتا ہے۔ پھلوں کی قسموں
میں فرق ہے لیکن تمام پرستش ایک ہے۔
عقیدے کے اظہار کے طریقے مختلف ہیں مگر
خدا ایک ہے۔"

خدا پرستی اور شرک میں بڑا فرق ہے۔ شرک
انسان میں جانوریت پیدا کرتا ہے اور خدا پرستی
انسانیت۔ اسی وجہ سے ویما کہتا ہے کہ

"وہ لوگ جو دل میں خدا کے موجود ہوتے
ہوئے اس سے بے خبر ہیں اور پتھروں کے سامنے
سر جھکاتے ہیں، جانور ہیں۔ کیا زندہ معبود
کے مقابلے میں پتھر بہتر ہے۔"

مورت پرستی اور خدا پرستی کی اصلیت کو ویما
نے یہاں واضح کیا ہے۔ اسی طرح وہ خداپرستی
اور جاترا کے تخیل میں تصادم دیکھتا ہے۔ وہ
کہتا ہے کہ

"جو لوگ دوسرے ملکوں کی جاترا۔ خدا کو پالینے کی

خاطر کرتے ہیں جب کہ وہ ان کے اندر
موجود ہے"

خدا کی اصلیت سے بے خبر ہیں ۔ خدا پرست
انسان اپنے پر قابو پاتا اور اپنی خواہشوں کو
تہذیب دیتا ہے ۔ انسان جو شہوت پرست ہے
اور اپنے کو خدا پرست بھی کہتا ہے حقیقت میں
خدا پرستی سے بہت دور ہے ۔ ایسے انسانوں
نے نہ خدا کو دیکھا اور نہ پایا ۔ ویما کہتا ہے کہ

"بیوقوف وہ ہے جس کو شہوت ستاتی رہتی
ہو ۔ ایسی حالت میں وہ خدا پرستی کی جستجو
میں کیوں منہمک ہے ؟ اپنی شہوت کو
چھوڑ دے تو خدا کو تو دیکھ سکے گا۔"

انسان کا شک و شبہہ خدا پرستی ہی سے
دور ہوسکتا ہے کیونکہ اس طرح اس کو دل
کا سکون نصیب ہوجاتا ہے ۔ اس خیال کو ویما
اس طرح ادا کرتا ہے کہ

"اگر وہ دنیا میں رہتے ہوئے خدا سے آشنا
نہیں ہوا تو شک و شبہہ سے کبھی آزاد
نہ ہوسکے گا۔"

خدا پرستی کے راستے میں جس طرح انسان کی شہوت اور اس کا شک و شبہہ حائل ہوتے ہیں اسی طرح اس کا مطالعہ بھی۔ ویما اپنے خیالات ان الفاظ میں پیش کرتا ہے کہ

"اس کا کل مطالعہ اور علم، خدائی کے تصور کو مبہم کردیتا ہے۔ وہ جس لمحہ کسی خوبصورت عورت کو دیکھ لیتا ہے تو اپنی پارسائی کو بھول جاتا ہے"

یا

"مطالعہ کی زیادتی مناظرے کی خواہش کو پیدا کرتی ہے۔ یہ محض بکواس ہے۔ انسان اس کے ذریعے خدا کو حاصل نہیں کرسکتا۔ مثل ریشم کے کیڑے کے وہ اپنے خیالوں کے جال میں پھنس جاتا ہے"

یا

"یہ تمام مطالعہ کس مقصد کے لیے ہو رہا ہے؟ درویش کی زندگی سے کیا حاصل؟ متضاد درشنوں (فلسفیانہ دبستانوں) میں الجھا کر اپنے کو کیوں تباہ کرتے ہو؟ خدا کی

پرستش کرو اور اس کو پہچانو کہ تیرے دل
میں وہ آباد ہے۔"

یا

"مطالعہ سے اس کا پتہ نہیں لگ سکتا۔ وہ
شاہی درباروں میں نہیں ہے، نہ مناظروں
میں، نہ خدائی کے متعلق پھوٹ ڈالنے والوں
کے امتیازی عقائد میں ۔ اس بڑی ہستی کو
تم اس طرح دیکھ نہیں سکتے گو اس کا
وجود بظاہر نمایاں ہے۔"

یا

"گو انسان نجوم کا مطالعہ کتنا ہی کرے لیکن
اس کا انجام خدا ہی کو معلوم ہے۔"
عقل بھی خدا کے سمجھنے سے قاصر ہے ۔ ویما
کہتا ہے کہ
"زندگی کے چکر میں پھنس کر عقل خدا
کو پہچان نہیں سکتی ۔ اپنے جسم کو مندر
میں تبدیل کرو اور اپنے پر قابو پاؤ۔ دنیوی
خیالات ترک کرو اور اپنے دل کی آنکھ کھولو۔
اس طرح سب کچھ دکھ اور ل جائے گا۔"

انسان اپنی زندگی میں بعض مرتبہ خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ جذبہ خوف ایک نفسیاتی خامی ہے۔ اس کے ہاتھوں سیکڑوں انسان گھائل ہوتے ہیں۔ خدا پرستی خوف کا تریاق ہے۔ ویما کہتا ہے کہ

"دیکھو! تمام خوف لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ جب
خوف ہم کو چھوڑ دیتا ہے تو خدائی کے
رنگ میں ہم رنگے جاتے ہیں۔ یہ جسم تباہ
ضرور ہوگا۔ اے ویما! اس بات کا اعلان
کر کہ صرف زندہ روح ہی فتح پائے گی۔"

ویما کی نظروں میں وہی انسان زندہ ہے جو خدا میں محو ہوکر زندگی بسر کر رہا ہو۔ اسی وجہ سے ویما نے کہا کہ

"ویدوں اور شاستروں کے سننے سے کیا تم
بہتر ہو جاتے ہو؟ تم گھر گھر پھر کر آخر
مر جاتے ہو۔ خدا کی بڑائی یا عظمت کو جانو۔
اس طرح تم حقیقت میں زندہ رہ سکوگے۔"

خدا حق ہے۔ اس خیال کو ویما بڑی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے:

"چھ سوگندھ گو مختلف ہیں لیکن ذائقہ ایک ہے۔

حق کے متعلق بہت سے راستے ہیں لیکن
حق ایک ہے۔ بزرگوں کا آپس میں بے حد
اختلاف ہے، لیکن جس کی پرستش کی جاتی
ہے وہ اصل میں ایک ہی ہے۔"

جس انسان نے حق کو جان لیا اس نے زندگی
پر قابو پالیا۔ ویما نے حق کی تعریف یوں
کی ہے کہ

"اگر تو حق سے واقف ہوچکا ہے تو تجھے
محسوس بھی نہ ہوگا کہ رنج کس کو کہتے ہیں"

یا

"جو انسان حق کو جان گیا ہے اس نے خدا
کو جان لیا ہے۔ اس طرح اپنی خواہشوں
کو وہ ختم کردیتا ہے۔"

حق خدا ہے اور خدا حکمت۔ ویما نے
اس دقیق خیال کو سلیس پیرائے میں یوں ادا
کیا کہ

"اگر تو حق سے واسطہ رکھے تو حکمت حاصل
کرسکتا ہے۔ حق اسی وقت دیکھ سکتا ہے جبکہ
تو حکمت کو پالے۔ وہ انسان دوبارہ زندہ

ہوگیا جس نے حق اور حکمت کا توازن اپنے
میں قائم کرلیا"

کیونکہ

"حکمت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نعمت نہیں
ہے۔ صرف اسی کو حکمت نصیب ہوتی ہے
جو اس کی قدر جانتا ہے۔ علم کا مقابلہ علم
سے ہوسکتا ہے۔ حکمت سب سے بہتر ہے"۔

ویاسؔ کا عقیدہ تھا کہ

"وہ بد بخت برباد ہوجائیں گے جو اس حکمت
کے سمجھنے کے اہل نہیں ہیں"۔

حکمت کوئی فلسفۂ نہیں بلکہ خدا پرستی میں موجود ہے۔

"خدا کو دیکھ کر حکمت مکمل ہوجاتی ہے۔ انسان
اپنے کو دیکھ کر دھوکے میں پھنس جاتا ہے۔
خدا کو جان لیا تو اپنے کو پہچان لیا۔"

خدا کا کوئی روپ نہیں ہے۔ وہ بے روپ
ہے۔ ویاسؔ کا ارشاد ہے کہ

"کمبل، گھنٹیاں، پازیب، گنجا سر اور زرین بندی!
یہ تمام سب کی سب خدا پرستی کے لیے
بے سود ہیں کیونکہ خدا کا وجود غیر مادی ہے"۔

خدا پرستی موت کے خوف کو بھی انسان سے الگ کردیتی ہے۔ ویماؔ نے خوب کہا ہے کہ

"انسان موت کی وجہ رنج کرتا اور روتا ہے
کہ "وہ مرگیا وہ مرگیا" مصیبت زدہ انسانوں
کی حماقت بیان نہیں کی جاسکتی۔ کیا روح
موت کے بندھن میں ہے؟"

یا

"لڑکے یا بیوبیاں کہاں ہیں؟ رشتہ دار کہاں
ہیں؟ دولت یا نوکر کہاں ہیں؟ ہماری موت
کے وقت وہ سب کے سب کیا کریں گے؟
ان میں سے ایک بھی ہمارے قریب نہیں
آتا۔ یہی ان کی فطرت ہے۔"

اسی طرح ویماؔ نے دنیا کے حشر کے متعلق یوں کہا کہ

"یہ دنیا معہ اپنے پہاڑوں اور سمندروں کے ایک
دن فنا ہوجائے گی، تب دیوتا اور پیغمبر بھی
ختم ہوجائیں گے اور فاتح کس طرح بچ سکیں گے؟"